نومبر ۱۹۸۹ء

ماہنامہ

لاہور

میثاق

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

اُمّتِ مسلمہ کے عروج و زوال کے ۲ دور — اور
موجودہ احیائی مساعی کا اجمالی جائزہ

ڈاکٹر اسرار احمد کی ایک فکر انگیز تحریر

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی

تازہ، خالص اور توانائی سے بھرپور

پاک پیئور®

مکھن اور دیسی گھی

یونائیٹڈ ڈیری فارمز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
(قائم شدہ ۱۸۸۰) لاہور
۲۲- لیاقت علی پارک ۴- بیڈن روڈ- لاہور، پاکستان
فون: ۲۲۱۵۹۸ - ۳۱۲۷۵۴

SV ADVERTISING

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

جلد: ۳۸
شمارہ: ۱۱
ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ
نومبر ۱۹۸۹ء
فی شمارہ ۵/-
سالانہ زرتعاون ۵۰/-

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

SUBSCRIPTION RATES OVERSEAS

U S A US $ 12/=
c/o Dr Khursid A. Malik
SSQ 810 73rd street
Downers Grove I L 60516
Tel : 312 969 6755

CANADA US $ 12/=
c/o Mr. Anwer H. Qureshi
SSQ 323 Rusholme Rd # 1809
Toronto Ont M6H 2 Z 2
Tel : 416 531 2902

MID-EAST DR 25/=
c/o Mr. M. Ashraf Faruq
JKQ P.O. Box 27628
Abdu Dhabi
Tel : 479 192

K S A SR 25/=
c/o Mr. M. Rashid Umar
P O. Box 251
Riyadh 11411
Tel : 476 8177

c/o Mr. Rashid A. Lodhi
SSQ 14461 Maisano Drive
Sterling Hgts MI 48077
Tel : 313 977 8081

UK & EUROPE US $ 9/=
c/o Mr. Zahur ul Hasan
18 Garfield Rd Enfield
Middlessex EN 34 RP
Tel : 01 805 8732

INDIA US $ 6/=
c/o Mr. Hyder M. D. Ghauri
AKQI 4 -1-444, 2nd Floor
Bank St Hyderabad 500 001
Tel : 42127

JEDDAH (only) SR 25/=
IFTIKHAR-UD-DIN
Manarah Market,
Hayy-ul-Aziziyah,
JEDDAH.
TEL: 6702180

D.D./Ch. To, Maktaba Markazi Anjuman Khudam ul Quran Lahore.
U B L Model Town Ferozpur Rd Lahore.

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن

حافظ عاکف سعید

حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقامِ اشاعت: ۳۶- کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰ - فون: ۸۵۶۰۰۳-۸۵۶۰۰۴

سب آفس: ۱۱- داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی - فون: ۲۱۶۵۸۶

پبلشرز: لطف الرحمٰن خان طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال ——— ۳

عاکف سعید

الھدیٰ ——— ۵

تواصی بالحق کا دورۂ سنام : جہاد فی سبیل اللہ (۲)

ڈاکٹر اسرار احمد

تذکرہ وتبصرہ ——— ۱۷

امتِ مسلمہ کے عروج وزوال کے دو ادوار

اور موجودہ احیائی مساعی کا اجمالی جائزہ

ڈاکٹر اسرار احمد کی ایک فکر انگیز تحریر

دعوت وتحریک ——— ۵۱

تبلیغی جماعت کے ذمہ دار حضرات سے

دردمندانہ گزارش (۲)

از قلم: سید تنظیم حسین

رفتارِ کار ——— ۵۹

سیف گیمز میں خواتین کی شرکت کے خلاف تنظیم اسلامی کے مظاہرے۔

"شمشیر وسناں اوّل، طاؤس ورباب آخر"

(شام الہدیٰ کراچی میں امیر تنظیم اسلامی کا خطاب)

روداد سفر ——— ۷۳

امیر تنظیم اسلامی کا حالیہ دورۂ بھارت

مرتب: شیخ رحیم الدین دکنی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ احوال

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ امّتِ مسلمہ اس وقت دینی اور دنیوی دونوں اعتبارات کے شدید اضمحلال اور زبوں حالی کا شکار ہے بالخصوص مملکتِ خداداد پاکستان جس میں پچھلے چالیس سالوں میں اسلام کا نعرہ حلق پھاڑ پھاڑ کر لگایا جاتا رہا ہے، نہ صرف یہ کہ اپنی بقا اور سالمیت کے اعتبار سے شدید طور پر عدم استحکام کا شکار نظر آتا ہے بلکہ حالیہ انتخابات میں راسخ العقیدہ اسلام کی کھلی شکست کے بعد یہاں "زبانی جمع خرچ" والے اسلام کی چوبیں بنیادیں بھی بُری طرح لرزتی محسوس ہوتی ہیں۔ اس صورتِ حال نے دین و ملت سے قلبی تعلق رکھنے والے ہر باشعور مسلمان کے ذہن میں اسلام کے مستقبل کے بارے میں ایک سوالیہ نشان کھڑا کر دیا ہے۔ غالباً یہی سبب ہے کہ ڈیڑھ ماہ قبل بلادِ مغرب کے دورے سے واپس تشریف لاکر امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنے خطابات اور تقاریر میں جس معاملے کو سب سے زیادہ موضوعِ گفتگو بنایا، وہ یہی تھا۔ یعنی "امّتِ مسلمہ کا ماضی، حال اور مستقبل"۔ بلکہ اس موضوع پر امیر تنظیم نے لندن اور ریاض میں بھی تقاریر فرمائی تھیں۔ ضرورت اس امر کی تھی اور بعض احباب کی جانب سے یہ تقاضا بھی سامنے آیا کہ اس موضوع پر امیر محترم کے کسی ایک خطاب کو مرتب و مدوّن کر کے 'میثاق' میں شائع کیا جائے تاکہ اس کا دائرہ افادہ مزید وسیع ہو جائے اور 'امّت' کے ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں ایک واضح اور مربوط خاکہ اُن افراد کے سامنے آ سکے جو اس معاملے میں شدید خلجانِ ذہنی کا شکار ہیں۔

خوش قسمتی سے اس موضوع سے متعلق محترم ڈاکٹر صاحب کی ایک وقیع تحریر کا مسودہ ہمارے پاس محفوظ تھا۔ یہ تحریر آج سے پندرہ سال قبل نومبر ۱۹۷۸ء کے 'میثاق' میں شائع ہوئی تھی جسے بعد میں "سرافگندیم" نامی کتابچے میں بطور مقدمہ شامل کر دیا گیا تھا۔ لیکن اب پچھلے کئی سالوں سے یہ کتاب بھی عدم دستیابی کے باعث نایاب تھی۔ چنانچہ وقت کے تقاضے کے پیشِ نظر اب کتابی شکل میں اس کی ازسرِنو طباعت سے قبل اسے زیرِ نظر شمارے میں شامل کیا جا رہا ہے۔

جیسا کہ رفقاء و احباب کے علم میں ہے، امیر محترم امّتِ مسلمہ کے ماضی یا عروج و زوال کے بارے میں جب گفتگو کرتے ہیں تو اُن کی گفتگو محض زمانی ترتیب یا اہم واقعات کے بیان پر مشتمل نہیں ہوتی بلکہ

وہ امتِ مسلمہ کی تاریخ کو اُس فرمانِ نبویؐ کی روشنی میں جس کی رُو سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امتِ مسلمہ کی تاریخ کو حیرت انگیز طور پر تاریخ بنی اسرائیل کے مشابہ قرار دیا تھا، تاریخِ بنی اسرائیل کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔ اور بنی اسرائیل کی تاریخ کے بارے میں رہنمائی اُنہیں سورۃ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع سے حاصل ہوتی ہے جس میں صراحتہً بنی اسرائیل کے عروج و زوال کے دو ادوار کا ذکر ہے اور رکوع کے اختتام پر بنی اسرائیل کے تیسرے عروج کو تمسک بالقرآن کے ساتھ مشروط کر دیا گیا ہے محترم ڈاکٹر صاحب کی نپی تلی رائے ہے کہ امتِ مسلمہ کا آئندہ تیسرا دورِ عروج بھی تمسک بالقرآن کی بدولت ہی ممکن ہے۔ یوں قرآن و حدیث کی نصوص کے حوالے سے امتِ مسلمہ کے عروج و زوال اور مستقبل کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا تجزیہ عروج و زوال کے محض واقعاتی بیان تک محدود نہیں رہتا بلکہ ایک THESIS کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس میں علمی ہی نہیں عملی رہنمائی کا سامان بھی مضمر ہے اور یہی وہ چیز ہے جس سے اس کی اہمیت کئی چند ہو جاتی ہے۔

محترم ڈاکٹر صاحب کی یہ تحریر جس کا عنوان خود انہوں نے "امتِ مسلمہ کے عروج و زوال کے دو دور اور موجودہ احیائی مساعی کا اجمالی جائزہ" معین فرمایا تھا، دراصل امتِ مسلمہ کے ماضی اور حال کو COVER کرتی ہے 'مستقبل' کا ذکر صراحتہً اس میں موجود نہیں ہے۔ چنانچہ ہماری کوشش ہوگی کہ یہ بحث امیر محترم کی حالیہ تقاریر میں سے اخذ کر کے آئندہ شمارے میں ہدیۂ قارئین کر دی جائے تاکہ بحث کا کوئی گوشہ تشنہ نہ رہ جائے۔

امیر تنظیم اسلامی ہندوستان کے چودہ روزہ دورے سے بحمد للہ ۲۶ اکتوبر کو واپس تشریف لے آئے تھے۔ یہ سفر اس اعتبار سے بہت تھکا دینے والا تھا کہ کل چودہ دنوں میں انہوں نے آٹھ شہروں کا دورہ کیا۔ اور ابتدائی پانچ دنوں میں اُن کی ۱۳ تقاریر ہوئیں۔ ۲۷ تاریخ کو خطابِ جمعہ میں امیر محترم نے اس دورے کے تاثرات بیان فرمائے تھے۔ وقت کی کمی کے باعث اس شمارے میں انہیں شامل نہیں کیا جا سکا تاہم اس پر مشقت سفر کی رُوداد کی پہلی قسط اس شمارے میں شامل ہے۔ یہ رُوداد رفیقِ تنظیم اور ہمارے رفیقِ کار شیخ رحیم الدین صاحب کی تحریر کردہ ہے جو اس سفر میں امیر محترم کے ہم رکاب تھے۔

تنظیم اسلامی نے منکرات کے خلاف پُرامن احتجاجی مظاہروں کی شکل میں 'جہاد باللسان' کی جس

(باقی صـ۷۲ پر)

'تواصی بالحق' کا ذروۂ سنام

جہاد فی سبیل اللہ

مراحل و مدارج

(۲)

لفظِ جہاد کے لغوی مفہوم کے معیّن ہونے کے بعد اور اس بات کو اصولی طور پر سمجھنے کے بعد کہ کسی بھی صاحب کردار اور صاحبِ سیرت انسان کے لئے کسی نظریئے کو قبول کرنے کے بعد اُس نظریئے کے لئے اپنی جان و مال کا کھپانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اب آیئے ہم یہ دیکھیں کہ جہاد فی سبیل اللہ کا نقطۂ آغاز کیا ہے۔ اس کی اوّلین منزل کیا ہے اور اس کی آخری منزلِ مقصود کونسی ہے۔ یہ تین باتیں مجاہدہ فی سبیل اللہ کے ضمن میں بہت اہم ہیں۔

جہاد فی سبیل اللہ کا نقطۂ آغاز مجاہدہ مع النفس

ایک بندۂ مومن کے لئے جہاد فی سبیل اللہ کا نقطۂ آغاز خود اپنے نفس کے ساتھ مجاہدہ ہے۔ اس لئے کہ ایمان کا حاصل یہی تو ہے کہ انسان نے اللہ کو مانا، اللہ کے رسولؐ کو مانا، اللہ کی کتاب کو مانا، آخرت کو مانا، بعثِ بعد الموت، حساب کتاب اور جزاء و سزا کو مانا۔ اگر یہ ماننا صرف اِقْرَارٌ بِاللِّسَان کے درجے میں نہیں، محض ایک 'DOGMA' یا ایک متوارث عقیدہ

(RACIAL CREED) نہیں ہے بلکہ فی الواقع ان حقائق پر انسان کا ذہن مطمئن ہو چکا ہے، دل میں یقین جاگزیں ہو گیا ہے اور اس سے اُس کا باطن منوّر ہو گیا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ ایک کشمکش اس کے اپنے اندر پیدا ہو گی۔ ایک تصادم اس کی شخصیت کے داخلی میدانِ کارزار میں برپا ہو جائے گا۔ ایک طرف نفس کے تقاضے اور انسان کا وہ نفسِ امّارہ (BASER SELF) ہے جسے قرآن کہتا ہے: ـــــــ "اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ"۔ یا جسے جدید محققین مثلاً فرائڈ نے "IDD" یا "LIBIDO" سے تعبیر کیا ہے۔ یہ انسان کے حیوانی داعیات وجبلّات (ANIMAL INSTINCTS) بڑے منہ زور ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ فرائڈ کا مشاہدہ اگر اُسے اس طرف لے گیا کہ جنس کا جذبہ انسان میں ایک بڑا قوی محرّک ہے تو یہ بات کُلّیتہً غلط نہیں ہے۔ فی الواقع یہ سارا تمدّن کا ہنگامہ اور یہاں کی چہل پہل اسی کی بنیاد پر قائم ہے۔ اسی طرح اگر کسی اور مفکّر نے اس حقیقت کی طرف لوگوں کو متوجّہ کیا کہ پیٹ انسان کے اندر ایک بہت بڑا عامل اور محرّک ہے۔ انسان کی معاشی ضروریات اُس کے لئے بہت بڑے محرّک کی حیثیت رکھتی ہیں تو واقعتہً اس میں ہرگز کوئی شک نہیں یہ بڑے منہ زور داعیات ہیں۔ انسان کے اندر سے اُبھرنے والے یہ داعیات اپنے طور پر کسی صحیح اور غلط، حلال اور حرام یا جائز و ناجائز کی تمیز کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ جذبات اندھے اور بہرے ہیں۔ انہیں صرف اپنے تقاضے کی تسکین سے غرض ہے۔ بھوک اگر لگی ہے تو پیٹ صرف یہ چاہتا ہے کہ اس کے جہنّم کو بھر دیا جائے۔ اگر شہوت کا جذبہ اُبھرا ہے تو اُسے غرض صرف اپنی تسکین سے ہے۔ اُسے اس سے کوئی غرض نہیں کہ حلال کیا ہے اور حرام کیا ہے اور جائز کیا ہے اور ناجائز کیا ہے۔ لیکن اگر اللہ کو مانا ہے، اگر اللہ کے رسولؐ کو مانا ہے تو ان کی طرف سے عائد کردہ حلال اور حرام کی قیود کی پابندی کرنی ہو گی۔ جیسے کہ سورۃ التغابن میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ ایمان کا لازمی نتیجہ اطاعت ہے: اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ یعنی اب تمہارے وجود اور تمہارے اعضاء و جوارح سے ایسی کوئی حرکت صادر نہیں ہونی چاہیئے جو اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کو توڑنے والی ہو۔ تمہارے تمام اعضاء و جوارح سے جو اعمال صادر ہوں وہ اللہ اور اس کے

رسولؐ کی اطاعت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں ۔ یا جیسے کہ ہم ابھی دیکھ چکے ہیں سورۃ الحجرات میں " لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ " اللہ اور اس کے رسولؐ سے آگے مت بڑھو ۔ مومن کی آزادی کے بارے میں حضورؐ نے تشبیہاً بیان فرمایا کہ مومن کی مثال اس گھوڑے کی سی ہے جو کہ ایک کھونٹے سے بندھا ہوا ہے ۔ جتنی رسی دراز ہے اسی قدر وہ کھونٹے کے گرد گھوم پھر سکتا ہے ' اس سے زائد نہیں ۔ یہ حدود اللہ ہیں ۔ اُن کے بارے میں قرآن کہتا ہے " تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا " اور کہیں فرمایا گیا : " وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ " جو کوئی اللہ کی حدود سے تجاوز کرے گا وہی ظالم ہے ۔ تو معلوم ہوا کہ یہ ایک کشمکش ہے جو ایمان کے نتیجے میں انسان کی شخصیت کے داخلی میدانِ کارزار میں شروع ہو جاتی ہے ۔ اس کشمکش کا آغاز اُسی لمحے ہو جاتا ہے جیسے ہی ایمان دل میں داخل ہوتا ہے ۔ البتہ جب تک لوگ زبان پر رہتا ہے کوئی کشمکش نہیں ہوتی ؛ صرف قول ہی تو ہے ' کوئی پرواہ نہیں اس لئے کہ جیسے کہ آئندہ سورۃ الصف کے درس میں یہ مضمون آنے والا ہے : " لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ " " کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں " ۔ قول اور فعل کا تضاد تو دنیا کی ایک عام مشاہدے کی چیز ہے کہ زبانی اقرار کسی اور بات کا ہے اور عمل کسی اور چیز پر ہو رہا ہے ۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب کوئی خیال یا کوئی نظریہ انسان کے باطن میں اتنا گہرا اتر جائے کہ وہ یقین بن کر دل میں بیٹھ جائے تو اب اس کا نتیجہ تصادم اور کشمکش کی صورت میں برآمد ہو کر رہے گا ۔ اب ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ تمہاری بھوک ہو یا شہوت ہو ' خواہ کوئی اور فطری جذبہ اور تقاضا تمہارے باطن میں سے اُبھر رہا ہو اس کی تسکین اب حلال اور حرام کے قیود اور حدود کے اندر اندر کرنی ہوگی ۔ مادر پدر آزاد ہو کر اب کوئی کام نہیں ہوگا ۔ یہیں سے اِس کشمکش کا آغاز ہو جاتا ہے ۔ چنانچہ نبی اکرمؐ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا : اَیُّ الْجِهَادِ اَفْضَلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اے اللہ کے رسول سب سے اعلیٰ اور افضل جہاد کون سا ہے ۔ جواباً آپؐ ارشاد فرماتے ہیں : " اَنْ تُجَاهِدَ نَفْسَكَ فِیْ طَاعَةِ اللّٰهِ " یہ نقطۂ آغاز ہے جہاد کا " کہ تو اپنے نفس کے ساتھ کشمکش کرے اور اُسے اللہ کی اطاعت کا عادی اور خوگر بنائے " ۔ جیسے کہ ایک اور مقام پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ —

" لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ ھَوٰہُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِہٖ "۔ " تم میں سے کوئی شخص حقیقی معنیٰ میں مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی ہوائے نفس، اس کی خواہشِ نفس تابع نہ ہو جائے اس کے کہ جو میں لے کر آیا ہوں"۔ یہ بات میں حقیقتِ شرک کے ضمن میں عرض کر چکا ہوں کہ شرک کی ایک بڑی ابتدائی اور بڑی بنیادی کیفیت یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کو اپنا معبود بنالے۔ سورۃ الفرقان کی آیت ۴۳ میں فرمایا گیا: " اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـھَہٗ ھَوٰہُ "۔ " کیا تم نے دیکھا اس شخص کو جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنالیا "۔ مولانا رومؒ نے بھی فرمایا تھا کہ ؎

نفسِ ما ہم کمتر از فرعون نیست　　لیک او را عون ایں را عون نیست

—— میرا یہ نفس بھی فرعون سے کم نہیں ہے۔ یہ خدا کے حکم سے سرتابی کرتا ہے۔ اُس کے حکم کے مقابلے میں اپنی چاہت اور اپنی پسند کا تقاضا کرتا ہے کہ اُسے مقدم رکھا جائے۔ اسے بالاتری اور بالادستی حاصل ہونی چاہیئے۔ یہ کش مکش درحقیقت جہاد فی سبیل اللہ کا نقطۂ آغاز ہے۔ اچھی طرح جان لینا چاہیئے کہ جو لوگ مجاہدہ فی سبیل اللہ کے اس باطنی میدانِ کارزار میں کوئی فتح اور بالادستی حاصل کئے بغیر باہر کے دشمنوں سے لڑائی لڑنا شروع کر دیتے ہیں، وہ دراصل خود فریبی کا شکار ہیں۔ —— باہر کے دشمنوں سے نبرد آزمائی اور مجاہدہ و مقاتلہ سے پہلے اپنے نفس سے کشمکش اور اُسے احکامِ الٰہی کا پابند بنانے کی جدّ و جہد لازم اور ناگزیر ہے۔ اس لئے کہ جہاد و مجاہدے کا صحیح اور فطری طریقہ یہی ہے کہ مجاہدے کا آغاز خود اپنی ذات سے ہو۔ جس طریقے سے کہ ایک پودا زمین میں سے نکلے پھوٹے اور پھر پروان چڑھے تو وہ ایک مضبوط و تناور درخت بن سکتا ہے " اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ "۔ اسی طرح مجاہدہ مع النفس وہ جڑ ہے جو انسانی شخصیت کے باطن میں اگر گہری نہ اُتر گئی ہو اور صرف اوپر اوپر ہی زمین میں اٹکی ہوئی ہو تو پھر یہ کسی بھی سیلاب اور کسی بھی نوع کے دباؤ کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

جہاد فی سبیل اللہ کا دوسرا مرحلہ

ہاں یہ مجاہدہ مع النفس جب انسان

کے باطن سے پھوٹتا ہے تو یہ اللہ کے دشمنوں سے اور اللہ کے دین کے دشمنوں سے مجاہدہ، کشمکش اور جدوجہد کی صورت اختیار کرتا ہے۔ اس کی اوّلین منزل ہے دعوت اور تبلیغ و تلقین۔ یہ ہے درحقیقت اس مجاہدہ فی سبیل اللہ کا خارج میں پہلا ہدف کہ جو بات آپ نے حق مانی ہے اس کی حقّانیت کا اعلان کیجئے۔ اس کی حقّانیت کو دنیا کے سامنے پیش کیجئے۔ یہ آپ کی شرافتِ نفس کا تقاضا بھی ہے۔ بڑی پیاری حدیث ہے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی: لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ۔ "تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے"۔ اگر آپ نے ایک حق کو قبول کیا ہے اُسے حق جان کر اور اُسے اپنے لئے ایک دولت اور نعمتِ غیرمترقبہ سمجھ کر، تو اب آپ کی شرافت و مروّت کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے بھائیوں تک بھی اس دولت کو پہنچائیے۔ اگر فی الواقع آپ ان کے خیرخواہ ہیں تو اُن کو اس دولت سے محروم دیکھنے پر آپ کے دل کو کڑھنا چاہئے۔ اسی طرح غیرت و حمیّت کا تقاضا بھی یہ ہے کہ اس حق کو دنیا میں پھیلایا جائے اور عام کیا جائے۔

پہلا ہدف: دعوتِ تبلیغ

اس تبلیغ کو آپ یوں کہہ لیجئے یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی کا ابتدائی مرحلہ ہے۔ اس میں تلقین اور نصیحت بھی شامل ہے اور حق کی نشر و اشاعت اور اس کا ابلاغ بھی شامل ہے۔ اس ابلاغ کے لئے ظاہر بات ہے کہ ہر دور میں جو بھی ذرائع میسّر ہونگے وہ استعمال کئے جائیں گے اور بھرپور طریقے پر استعمال کئے جائیں گے۔ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے زمانے میں جو ذرائع بھی ممکن تھے، ان سب کو استعمال کیا ہے۔ آپ کوہ صفا پر کھڑے ہوتے ہیں اور نعرہ لگاتے ہیں "وَاصَبَاحَا!" ہائے وہ صبح جو آنے والی ہے"۔ یہ اُس زمانے کا رواج تھا کہ اگر کسی کو یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ کوئی دشمن حملہ کرنے والا ہے تو وہ اپنے قبیلے کے لوگوں کو خبردار کرنے کے لئے اپنے کپڑے اتار کر

بالکل عریاں ہو کر کسی بلند مقام پر کھڑا ہو جاتا تھا تاکہ سب لوگ اسے دیکھ سکیں ۔ اور پھر نعرہ لگاتا تھا، واصباحاہ ! یعنی ہائے وہ صبح جو آنے والی ہے ۔ لوگ سمجھ جاتے تھے کہ کوئی بڑی اہم بات ہے ۔ چنانچہ سب اس کی طرف لپکتے اور پھر وہ اپنی خبر یا اطلاع لوگوں تک پہنچاتا تھا۔ حضورؐ کے بارے میں اس کا ہرگز کوئی سوال یا امکان نہیں تھا کہ آپ عریاں ہو جاتے لیکن باقی آپؐ نے وہ پورا طرزِ عمل اختیار کیا ۔ کوہِ صفا پر بلند مقام پر کھڑے ہو کر نعرہ لگایا، لوگ جمع ہوئے، آپؐ نے دعوت پیش کی ۔ یہ دوسری بات ہے کہ پورے مجمع میں سے کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی اور آپؐ کے سب سے قریبی رشتہ دار ابولہب نے یہ زہر آلود الفاظ کہے " تَبًّا لَّكَ أَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا " آپؐ کے ہاتھ ٹوٹ جائیں، کیا آپؐ نے اس کام کے لئے ہمیں جمع کیا تھا" ! نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ ۔ بہرحال بتانا اس وقت یہ تھا کہ اس ابلاغ، تبلیغ اور نشر و اشاعت کے لئے جو بھی وسائل ممکن ہوں اختیار کئے جانے چاہئیں ۔ سیرت میں ہمیں نظر آتا ہے کہ انفرادی ملاقاتیں بھی تھیں، آپؐ گلیوں میں بھی تبلیغ فرماتے تھے، جہاں کہیں معلوم ہوا کہ کوئی قافلہ ٹھہرا ہوا ہے وہاں پہنچ کر اپنی دعوت پیش فرماتے تھے ۔ حج کے ایام میں آپؐ کی یہ دعوتی سرگرمی پورے عروج کو پہنچ جاتی تھی ۔ ملک کے کونے کونے سے لوگ آئے ہوئے ہیں، آپؐ مختلف وادیوں میں گھوم رہے ہیں اور جہاں کہیں کسی قبیلے کا پڑاؤ دیکھا وہاں جا کر اپنی دعوت پیش کی ۔ وہ نقشہ جو حضرت نوح علیہ السلام کی اس دعا میں آتا ہے : رَبِّ إِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلًا وَنَهَارًا ۝ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَائِي إِلَّا فِرَارًا ۝ وَإِنِّي كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوا أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَأَصَرُّوا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۝ ثُمَّ إِنِّي دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۝ ثُمَّ إِنِّي أَعْلَنْتُ لَهُمْ وَأَسْرَرْتُ لَهُمْ إِسْرَارًا ۝

اے میرے رب! اے میرے پروردگار! میں نے اپنی اس قوم کو فرداً فرداً بھی پکارا، عام مجمعوں میں بھی انہیں دعوت دی، میں تنہائی میں بھی ان سے ملا، میں نے علی الاعلان بھی یہ بات کہی ہے میں نے رات کی تاریکیوں میں بھی پیغام پہنچایا ہے اور دن کی روشنی میں بھی اس پیغام کی نشر و اشاعت کی ہے ۔

یہ ہے درحقیقت جہاد فی سبیل اللہ کا اوّلین مرحلہ۔ اسے تبلیغ کہیئے، دعوت کہیئے، نشر و اشاعت کہیئے۔ اس میں محنت و مشقت ہوگی، اوقات صرف ہوں گے، صلاحیتیں کھپیں گی۔ ضرورت اس بات کی ہوگی کہ باصلاحیت لوگ آئیں اور اپنی صلاحیتوں کو اس راہ میں صرف کریں۔ ذہین اور فطین نوجوان آئیں اور وہ اس کام میں اپنے آپ کو جھونک دیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ پھر اپنے کاروبار میں منہمک نہیں ہوئے بلکہ آپ اسی کشمکش، اسی کوشش اور اسی جدّوجہد میں ہمہ تن مصروف ہوگئے اور چند سالوں کی محنت کا نتیجہ یہ نکلا کہ عشرہ مبشرہ میں سے چھ اصحاب کو لاکر انہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جھولی میں ڈال دیا۔ یہ ہے اُس مجاہدہ فی سبیل اللہ کی پہلی منزل!

یہ بات واضح رہنی چاہیئے کہ جنگ کا مرحلہ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں کہیں پندرہ برس کے بعد آیا۔ مکہ مکرمہ کے تیرہ برسوں میں اور پھر قیام مدینہ کے ابتدائی دو برسوں میں مجاہدہ جاری تھا۔ یہ جدوجہد اور کشمکش نظریاتی سطح پر تھی۔ یہ عقائد کا تصادم تھا جو جاری تھا اور اس میں لوگ تکالیف اور مصیبتیں بھی جھیل رہے تھے۔ جن لوگوں نے بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہا اور نیا عقیدہ اختیار کیا ان کے گھروں اور ان کی برادریوں میں کشمکش شروع ہوگئی۔ اپنے ماحول کے ساتھ اُن کا تصادم پوری شدت کے ساتھ شروع ہوگیا۔ وہ ستائے گئے، اُن کو ایذائیں دی گئیں جس کا نقشہ ہم دیکھ چکے ہیں سورۂ آلِ عمران کے آخری رکوع کی اس آیت میں کہ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقَاتَلُوْا وَقُتِلُوْا۔ یہ قتال کا مرحلہ یعنی غزوۂ بدر کا واقعہ تو کہیں ۲ھ کا ہے۔ لیکن پہلے پندرہ برس یہ کشمکش اور یہ تصادم جاری تھا۔ پھر جن لوگوں نے اس دعوت کو قبول کیا ان کی تربیت کرنا اور انکو ایک منظم جماعت کی شکل دینا بھی تو مجاہدے ہی کی ایک شکل تھی۔

دعوت و تبلیغ کی غرض و غایت: اتمامِ حجت

تو مجاہدہ فی سبیل اللہ کا اوّلین ہدف یہ ہے کہ خلقِ خدا پر خدا کی طرف سے دعوت و تبلیغ

کے ذریعے حجّت قائم کردی جائے۔ روزِ قیامت انسان یہ عذر نہ پیش کرسکے کہ اے رب ہمیں معلوم نہیں تھا کہ تیرا دین کیا ہے، تو چاہتا کیا ہے۔ یہ چیز ہمارے ابھی آئندہ درس میں وضاحت کے ساتھ آئے گی کہ انبیاء کی بعثت کی ایک بہت بڑی غرض "شہادت علی الناس" قرار دی گئی ہے۔ یہ گواہی اور یہ شہادت قولاً بھی دی جاتی ہے اور عملاً بھی۔ تاکہ خلقِ خدا پر حجّت قائم ہو جائے اور اُن کے پاس کوئی عُذر باقی نہ رہے۔ ظاہر بات ہے کہ اس کام میں محنتیں بھی لگیں گی اور صلاحیتوں کا صرف بھی ہو گا تبھی کوئی داعیٔ حق خلق خُدا پر حجّت قائم کر سکے گا کہ جو حق میرے پاس تھا میں نے تمہارے سامنے رکھ دیا ہے۔ تم یہ نہ کہہ سکو گے کہ میں نے اس کے بیان میں کتمان سے یا اخفاء سے کام لیا ہے۔ آپ اِسے قطعِ عذر کہہ لیں یا اتمامِ حجّت، بہرکیف یہ جان لیجئے کہ مجاہدہ فی سبیل اللہ کی اوّلین منزل یہی ہے۔ اس کے لئے قرآن کی اصطلاح ہے "شہادت علی الناس"! جو ہمارے اس منتخب نصاب میں اگلے درس کا موضوع ہے۔ سورۃ الحج کی آخری آیت کے حوالے سے انشاء اللہ اس پر مزید تفصیل کے ساتھ کلام ہوگا۔

مجاہدہ فی سبیل اللہ کا آخری ہدف

اس مجاہدہ فی سبیل اللہ کا آخری ہدف اور اس کی غایتِ قصوٰی کیا ہے؟ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اس کائنات کا سب سے بڑا حق یہ ہے کہ اللہ کی زمین پر اُسی کا حکم نافذ ہونا چاہئے۔ اَلۡاَرۡضُ لِلّٰہِ وَالۡحُکۡمُ لِلّٰہِ۔ زمین بھی اللہ کی ہے اور حکم بھی اللہ کا ہے۔ "اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ۔" حکم اور فیصلے کا اختیار سوائے اللہ کے کسی کو حاصل نہیں۔ گویا تمام حقائق میں سب سے فائق حق یہی ہے کہ اللہ کی زمین پر اُسی کے اختیار کو عملاً نافذ و غالب ہونا چاہئے۔ جب کہ بالفعل معاملہ اس کے برعکس ہے۔ چنانچہ اس حق کو بالفعل دنیا میں نافذ کرنے کے لئے اب ایک مزید محنت درکار ہوگی، مزید جدّوجہد کی ضرورت ہوگی۔ دعوت و تبلیغ کے لئے محنتیں اور کوششیں اپنی جگہ اہم ہیں لیکن یہ بات ذہن میں رکھیئے کہ اگر کسی بے ضرر قسم کی بات کی تبلیغ کی جا رہی ہو جس میں کسی پر کوئی تنقید نہ ہو اور جس میں کسی کے مفادات پر

کوئی آنچ نہیں آتی ہو تو کوئی تصادم نہیں ہوگا کوئی ٹکراؤ نہیں ہوگا۔ بلکہ بالعموم ایسے داعظین کو ہار پہنائے جاتے ہیں اور اُن کی خدمت کی جاتی ہے۔ لیکن اگر تبلیغ ہو صحیح معنیٰ میں کہ جس میں حقیقت ہی کو سامنے لایا جائے اور حق بات کے کہنے سے دریغ نہ کیا جائے خواہ اس سے لوگوں کے مفادات پر آنچ آرہی ہو، چاہے ان کے غلط نظریات اس سے مجروح ہو رہے ہوں تو ظاہر بات ہے کہ تصادم اور کشمکش کا مرحلہ آکر رہے گا: یہی وجہ ہے کہ یہ تصادم اور کشمکش مکّی دور میں بھی ہمیں نظر آتا ہے۔ لیکن اس سے آگے مرحلہ آتا ہے جب داعیٔ حق یہ کہتا ہے کہ ہم صرف مبلّغ نہیں ہیں، ہم صرف داعی نہیں ہیں، بلکہ ہم تو حق کو قائم اور غالب کرنے کے لئے اُٹھے ہیں۔ ہم صرف عدل اور انصاف کا وعظ کہنے کے لئے نہیں آئے بلکہ ہم عدل اور انصاف کو بالفعل نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بات ہے جو سورۃ الشوریٰ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہلوائی گئی کہ اے نبی ان سے کہہ دیجئے " وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ " کہ مجھے تو یہ حکم ہوا ہے کہ میں تمہارے مابین عدل قائم کردوں۔ ظاہر بات ہے کہ جب دعوت یہ ہوگی کہ اللہ کا عطا کردہ نظامِ عدل قائم کیا جائے، اُسے نافذ اور رائج کیا جائے تو یہ صرف تبلیغ و تلقین اور وعظ و نصیحت کا مرحلہ نہیں ہے بلکہ اقامتِ دین کا مرحلہ ہے۔ یہ صرف کسی نظام کی برکات کو علمی سطح پر پیش کر دینے کا نہیں بلکہ اس نظام کو فی الواقع قائم اور نافذ کر دینے کا مرحلہ ہے۔ تو سیدھی سی بات ہے کہ یہاں تصادم اب اور شدّت اختیار کرے گا۔ جن کے مفادات پر آنچ آئے گی وہ اُسے کبھی ٹھنڈے ٹھنڈے برداشت نہ کریں گے۔ وہ اپنی پوری قوتوں کو اور اپنے تمام وسائل و ذرائع کو مجتمع کر کے مزاحمت کریں گے اور اس دعوت کی راہ روکنے اور اسے کچلنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں گے۔ اس مرحلے پر یہ کشمکش اور یہ تصادم انتہائی شدید اور ہولناک صورت اختیار کرے گا۔

جہاد فی سبیل اللہ کی آخری منزل: قتال فی سبیل اللہ

تو اقامتِ دین اور غلبۂ دینِ حق کی اس جدوجہد میں جس کے لئے قرآن مجید کی

ایک اصطلاح " اِظْهَارُ دِیْنِ الْحَقِّ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ " کی بھی ہے، واقعہ یہ ہے کہ کوئی خواہ کتنا ہی ناپسند کرے تصادم کی یہ آخری منزل آکر رہے گی۔ آگ اور خون کی ندیوں کو بہرحال عبور کرنا ہوگا۔ اپنے خون کا نذرانہ بہرکیف پیش کرنا ہوگا۔ اس لئے کہ یہ نظام کو بدلنے کا معاملہ ہے۔ وعظ اور نصیحت سے آگے بڑھ کر عدل اور انصاف کو بالفعل رائج کرنے کا معاملہ ہے۔ یہاں وہ تصادم انتہائی شدت پکڑ لیتا ہے اور بالفعل جہاد 'قتال' کی شکل اختیار کرتا ہے۔

یہ ہے گویا اس مجاہدہ فی سبیل اللہ کا نقطۂ عروج جس کا نقطۂ آغاز ہے 'مجاہدہ مع النفس' از روئے الفاظ نبوی : " اَنْ تُجَاهِدَ نَفْسَكَ فِیْ طَاعَةِ اللّٰهِ "۔ نفس انسانی سے یہ مجاہدہ جب خارج کی طرف آتا ہے تو یہ تبلیغ دین، دعوت دین، احقاق حق، ابطال باطل، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی صورتوں میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ دنیا میں حق کی نشر و اشاعت اور بدی کے سدباب کے لئے وعظ و نصیحت، تلقین و تبلیغ اور افہام و تفہیم کی تمام قوتوں کو بروئے کار لانا اور ابلاغ کے ممکنہ ذرائع کو استعمال کرنا، اس جدوجہد کا اولین مرحلہ ہے اور اس سے اصل مقصود یہ ہے کہ خلق خدا پر خدا کی جانب سے حجت قائم کر دی جائے ـــــ اور اس کی بلندترین منزل ہے " اظہار دین الحقّ علی الدّین کلّہ" کہ پورے کے پورے دین پر اور پورے نظام زندگی پر اللہ کے دین کو غالب کر دیا جائے۔ قرآن مجید اس حقیقت کو کہیں یوں بیان کرتا ہے۔ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ کہ اے مسلمانو جنگ جاری رکھو، تمہاری یہ جنگ جاری رہنی چاہیئے یہاں تک کہ فتنہ بالکل فرو ہو جائے اور دین کُل کا کُل اللہ ہی کے لئے ہو جائے۔ اس زمین پر اللہ کا حق ہے کہ اُسی کی حکومت قائم ہو لیکن اگر یہاں کسی اور نے اپنی حکمرانی کا تخت بچھایا ہوا ہے اور کسی فرعون یا نمرود کی مرضی یہاں رائج ہے تو یہی درحقیقت قرآن حکیم کی اصطلاح میں فتنہ ہے۔ یہ فساد فی الارض کی بدترین شکل ہے۔ اس فتنے کو ختم کرنا اور اس بغاوت کو فرو کرنا ایک بندۂ مومن کا مقصد حیات بن جانا چاہیئے، اگر وہ واقعتاً اللہ کو ماننے والا ہے، اگر واقعتاً دین کو اس نے قلب اور ذہن کی متفقہ شہادت کے ساتھ قبول کیا ہے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلے گا کہ پھر وہ ہر اس نظام کو جس میں خدا کی مرضی اور خدا کے حکم کو فائنل اتھارٹی کی حیثیت سے قبول نہ کیا جائے، اُسے فتنہ اور بغاوت سمجھے گا،

چاہے وہاں بظاہر بڑا امن و امان ہو، چاہے وہاں ہر طرح سے زندگی کا کاروبار سکون سے جاری ہو، لیکن غیر اللہ کی حکومت اور غیر اللہ کا نظام مجسّم فتنہ، مجسّم فساد اور مجسّم بغاوت ہے لہٰذا اس کے خلاف سینہ سپر ہو جانا اور اپنے جان و مال کو دین کی حمایت میں کھپا دینا ایمان کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہ ایمانِ حقیقی کا رکنِ لازم ہے۔

ہمارے اس دورِ انحطاط میں جیسا کہ آغاز میں عرض کیا گیا، جہاد فی سبیل اللہ پر دو ظلم روا رکھے گئے۔ ایک یہ کہ اس کو جنگ کے مترادف قرار دے دیا گیا۔ اس کی وسعت، اس کی ہمہ گیری، اس کا نقطۂ آغاز، اس کے وہ سارے مراحل جن میں دعوت و تبلیغ بھی ہے، نشر و اشاعت بھی ہے پھر جو لوگ اس حق کو قبول کر لیں ان کو ایک نظم میں پرو کر ایک منظم قوت کی شکل دینا اور انہیں آئندہ کے مراحل کے لئے مناسب تربیت دینا بھی شامل ہے۔ یہ سب ذہن سے بالکل خارج ہو گئے ہیں۔ دوسرا ظلم یہ ہوا کہ مسلمانوں کی ہر جنگ کو بہر حال اور بہر نوع جہاد قرار دے دیا گیا۔ اس طرح 'جہاد' کے لفظ کو ہم نے انتہائی بدنام کر دیا اور اس کے مقدس تصوّر کو بہت بُری طرح مجروح کیا گیا۔ اور تیسرا ظلم اس پر یہ ڈھایا گیا کہ جہاد کو فرائضِ دینی کی فہرست سے خارج کر دیا گیا کہ یہ فرض عین نہیں ہے بلکہ فرض کفایہ ہے۔ یہ درحقیقت مسلمانوں کے اندر سے اُس جہاد کے جذبے کو ختم کرنے کی سازش کا حصّہ ہے۔ کہیں یہ سازش بڑے ہی گھناؤنے انداز میں ہوئی جیسے کہ غلام احمد قادیانی نے جہاد اور قتال کو اس دور میں بالکل منسوخ قرار دے دیا۔ ع دیں کے لئے حرام ہے اب دوستو قتال

یہ تو خیر انتہائی گمراہی کا معاملہ تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ خود ہمارے تصوّراتِ دینی میں اب یہ جہاد فی سبیل اللہ کسی فرض کی حیثیت سے موجود نہیں ہے۔ ہم یہ تو جانتے ہیں کہ نماز فرض ہے، ہمیں یہ معلوم ہے کہ روزہ فرض ہے، ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ زکوٰۃ فرض ہے ہر صاحبِ نصاب پر اور ہمیں یہ بھی خوب معلوم ہے کہ حج فرض ہے ہر صاحبِ استطاعت پر ——— لیکن یہ بات بالکل ذہن سے نکل گئی کہ جہاد بھی کوئی فرض عین ہے۔ یہ بھی کوئی دین کی طرف سے عائد شدہ ضروری فریضہ ہے۔ ضرورت ہے کہ اس تصوّر کو عام کیا جائے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ جہاد کا شمار 'ارکانِ اسلام' میں نہیں ہوتا۔ اسلامی ریاست کے شہری

ہونے کے لئے اور ایک مسلمان معاشرے میں ایک فرد کی حیثیت سے کسی کے قبول کئے جانے کے لئے جو کم سے کم لوازم ہیں، ان میں واقعۃً جہاد کا نام نہیں ہے۔ حدیثِ نبویؐ کے الفاظ واضح ہیں: بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ۔ شَهَادَةِ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَ اِقَامِ الصَّلٰوةِ وَ اِیْتَاءِ الزَّكٰوةِ وَ صَوْمِ رَمَضَانَ وَ حَجِّ الْبَیْتِ۔ ارکانِ اسلام میں یہی پانچ چیزیں ہیں لیکن وہ ایمانِ حقیقی جس کی بنیاد پر آخرت میں معاملے طے ہوں گے، جس کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ کسی کو آخرت میں مومن قرار دے گا، اس ایمانِ حقیقی کے ارکان دو ہیں: ایک یقینِ جو قلب میں جاگزیں ہو گیا ہو اور دوسرے اس کا جو اوّلین اور نمایاں ترین مظہر انسان کے عمل میں ہو، وہ جہاد ہے، وہ کش مکش اور تصادم ہے، اس راہ میں جان اور مال کا کھپانا ہے۔ اس کا نقطۂ آغاز ہے خود اپنے نفس کو اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کا پابند بنانے کے لئے اس کے ساتھ مجاہدہ۔ اور اس کے لئے پھر ابتدائی مرحلہ ہے دعوت، تبلیغ، نشر و اشاعت، تمام ممکنہ ذرائع ابلاغ کو کام میں لا کر حق کی دعوت کو پھیلایا جائے۔ اور اس کی آخری منزل یہ ہے کہ جس طریقے سے اس شخص نے اپنے وجود پر اللہ کے دین کو قائم اور اللہ کی مرضی کو نافذ کیا ہے، اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کو اس پر بالفعل قائم کر دیا ہے، اسی طرح پورے کرۂ ارضی پر اللہ کے دین کو عملاً نافذ اور غالب کرنے کے لئے جان اور مال لگائے۔ اس کے لئے تن من دھن سے کوشش کرے اور اگر ضرورت داعی ہو تو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ جنگ میں حاضر ہو جائے اور اللہ تعالیٰ توفیق دے تو مرتبۂ شہادت حاصل کرے ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت، نہ کشور کشائی!

یہ ہے اسلام میں جہاد کا وہ تصور جو اب ہمارے آئندہ دو درسوں میں مزید وضاحت کے ساتھ مزید منقح ہو کر سامنے آئے گا۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

تذکرہ وتبصرہ

اُمّتِ مسلمہ کے عروج وزوال کے دو دَور

تاریخ بنی اسرائیل کے پس منظر میں

— اور —

موجودہ احیائی مساعی کا اجمالی جائزہ

★

ڈاکٹر اسرار احمد کی ایک فکر انگیز تحریر

(ماخوذ از 'میثاق'، نومبر ۱۹۸۴ء)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا

وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ
فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ
عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ
اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ۭ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ۝
ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَ
جَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ۝ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۡ
وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ۭ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْۗءٗا وُجُوْهَكُمْ
وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا
تَتْبِيْرًا ۝ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا
جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ۝ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ
هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ
لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ۝ وَّاَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا
لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝

ہمارے نزدیک بیسویں صدی عیسوی کو اُمّتِ مسلمہ کی تاریخ میں ایک فیصلہ کن موڑ (TURNING POINT) کی حیثیت حاصل ہے، چنانچہ اس کے رُبعِ اوّل کے خاتمے کے لگ بھگ جبکہ اُمّت کے ایک حسّاس اور دردمند فرد کے دل کی گہرائیوں سے یہ درد انگیز صدا بلند ہوئی ؎

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے — اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد — دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے!!

(حالی)

تاریخ ایک کروٹ لے چکی تھی اور ملّتِ اسلامی کے تنِ مُردہ میں حیاتِ تازہ کے کچھ آثار ظاہر ہونے شروع ہو چکے تھے۔

اور اگر ذرا بنظرِ غائر مشاہدہ کیا جائے تو اس صدی کا درمیانی نصف تو ایک نہایت ہی عجیب نقشہ پیش کرتا ہے۔ یعنی یہ کہ ایک طرف تنزّل اور انحطاط کا عمل بھی جاری رہا اور نکبت و ادبار کے سائے مزید گہرے ہوتے چلے گئے جس کا نقطۂ عروج (CLIMAX) ۱۹۶۷ء اور ۱۹۷۱ء کی ذلّت و رسوائی ہے اور دوسری طرف ایک گھمبیر اور ہمہ جہتی احیائی عمل کا آغاز بھی ہو گیا جس کا نقطۂ آغاز ۲۰-۱۹۲۵ء کا زمانہ ہے گویا مسلسل پچاس

برس تک یہ دونوں مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ۝ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ۝[1] کی سی شان کے ساتھ پہلو بہ پہلو جاری رہے۔
کے ساتھ پہلو بہ پہلو جاری رہے۔

اس اجمال کی تفصیل کے ضمن میں ہم پہلے اُمّتِ مسلمہ کے عروج و زوال کا ایک اجمالی خاکہ تاریخی ترتیب (CHRONOLOGICAL ORDER) کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کریں گے، تاکہ ایک طرف 'عروج' کے ضمن میں ملّتِ اسلامی کی عظمت و سطوتِ گزشتہ کی ایک جھلک سامنے آئے اور علّامہ اقبال کے اس شعر کے مطابق کہ ؎

کبھی اے نوجواں مسلم تدبّر بھی کیا تُو نے؟
وہ کیا گردوں تھا تُو جس کا ہے اِک ٹوٹا ہوا تارا!

مسلمان نوجوان کو معلوم ہو کہ ایک وقت وہ بھی تھا جب عرب افواج جبر الٹر (جبل الطارق) سے شمال مشرق کی جانب بڑھتی ہوئی فرانس کے عین قلب تک جا پہنچی تھیں اور پھر ایک وقت وہ بھی آیا جب ترک افواج پُورے مشرقی یورپ کو روندتی ہوئی اٹلی کے دروازوں تک جا پہنچی تھیں۔ شاید کہ اسی طرح کچھ نوجوانوں کے دِل میں ملّتِ اسلامی کی تجدید اور اس کی عظمت و سطوتِ گزشتہ کی بازیافت کا جذبہ پیدا ہو جائے! ——— اور دوسری طرف 'زوال' کے ضمن میں یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ خدا کا عدل بے لاگ ہے اور اس کا قانون اٹل اور غیر متبدل۔ اس نے جو معاملہ سابق اُمّتِ مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کے ساتھ کیا بعینہٖ وہی ہمارے ساتھ کیا، حتّٰی کہ ہماری اور اُن کی تاریخ میں ایک حد درجہ حیرت انگیز مشابہت موجود ہے اس پہلو سے کہ یہود پر بھی اللہ تعالےٰ کے عذاب کے دو دور آئے اور ہم پر بھی دو ہی دور آئے۔ اگرچہ اُمّتِ محمّد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام کی وسعت کی نسبت سے

---

[1] سورۃ الرحمٰن، آیات ۱۹، ۲۰: "چلائے دو دریا ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ، (لیکن) دونوں کے مابین ایک پردہ (حائل) ہے کہ باہم ایک دوسرے پر غالب نہ آسکیں!"

ہمارے نجبت و ادبار کے یہ دَور بھی یہود کے مقابلے میں بہت طویل رہے اور جس طرح بنی اسرائیل کی تولیت کے زمانے میں بیت المقدس کے ناموس کا پردہ ؎

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں سو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک!

کے مصداق دو بار چاک ہوا اسی طرح ہمارے عہدِ تولیت میں بھی مسجدِ اقصےٰ کی حرمت دو ہی مرتبہ پامال ہوئی۔

اس کے بعد ہم اس گھمبیر اور ہمہ جہتی "احیائی عمل" کا اجمالاً جائزہ لیں گے تاکہ ایک طرف لوگوں کا اُفقِ ذہنی وسیع ہو اور وہ مختلف احیائی کوششوں کو ان کے صحیح پس منظر میں دیکھ سکیں اور دوسری طرف یہ بھی واضح ہو جائے کہ ہم خود اس ہمہ جہتی احیائی عمل کے کس گوشے میں ایک حقیر سی خدمت سرانجام دینے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ "لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ"[1] کے مصداق جو ہمارا ساتھ دینا چاہے وہ بھی پُورے انشراحِ صدر کے ساتھ دے اور جو تنقید کی 'خدمت' سرانجام دینا چاہے وہ بھی ہمارے موقف کو اچھی طرح سمجھنے کے بعد اس اہم مگر نازک فرض کی ادائیگی پر کمربستہ ہو!

(۱)

اُمّتِ مسلمہ کے عروج و زوال کے تاریخی خاکے کے ضمن میں دو باتیں پیشگی سمجھ لینی چاہئیں:۔

ایک یہ کہ اپنی ہیئتِ تشکیلی کے اعتبار سے اُمّتِ محمّد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام کے دو حصّے ہیں۔ پہلا "اُمّیّین" یعنی بنی اسمٰعیل پر مشتمل ہے اور اسے اس اُمّت کے قلب یا مرکز (NUCLEUS) کی حیثیّت حاصل ہے اور دوسرا "اٰخرین" یعنی دیگر اقوام پر مشتمل

---

[1] سورۃ الانفال آیت ۴۲: "تاکہ ہلاک ہو جسے ہلاک ہونا ہے حجّت قائم ہو چکنے کے بعد اور جیے جسے جینا ہو واضح دلیل کے ساتھ!"

ہے خواہ وہ کرد ہوں یا ترک، اہلِ فارس ہوں یا اہلِ ہند، افغان ہوں یا مغل، اہلِ حبش ہوں یا بربر، شرقِ بعید یعنی ملایا اور انڈونیشیا سے تعلق رکھتے ہوں یا مغربِ بعید یعنی مراکو اور موریطانیہ سے۔

دوسرے یہ کہ جغرافیائی اعتبار سے بھی عالمِ اسلام کو تین حصّوں میں منقسم سمجھنا چاہیے یعنی ایک قلب، دوسرے میمنہ اور تیسرے میسرہ۔ اگر دنیا کے نقشے کو سامنے رکھ کر عالمِ اسلام پر نگاہ جمائی جائے تو وہ ایک ایسے عقاب کے مانند نظر آئے گا جو اپنے دونوں بازوؤں کو پوری طرح پھیلائے محوِ پرواز ہو۔ جزیرہ نمائے عرب، عراق، فلسطین، شام اور ایشیائے کوچک جو عالمِ اسلام کے قلب کی حیثیت رکھتے ہیں اس عقاب کے جسم کے مانند نظر آئیں گے جن میں سے ایشیائے کوچک کو اس کے سر اور چونچ سے مشابہت ہے اور جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی حصّے کو اس کے دُم کے پھیلے ہوئے پروں سے۔ اس عقاب کا دایاں بازو (میمنہ) ایران، ترکستان، افغانستان اور برِّصغیر ہند و پاک سے ہوتا ہوا ملایا اور انڈونیشیا تک پھیلا ہوا ہے اور بایاں بازو (میسرہ) پورے شمالی افریقہ کو لپیٹ میں لیتا ہوا سپین تک چلا گیا ہے۔

اب آیئے تاریخی خاکے کی طرف:

سنِ عیسوی[1] کے حساب سے اُمّتِ مسلمہ کی تاریخ کا آغاز ساتویں صدی سے ہوتا ہے اس لیے کہ آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ولادت باسعادت اغلباً ۵۷۱ء میں ہوئی۔ ۶۱۰ء میں آپؐ نے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا اور محتاط ترین حساب کے مطابق اپریل ۶۳۲ء میں آپ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک 'اسلامی انقلاب' کی تکمیل فرما کر "رفیقِ اعلیٰ" سے جا ملے، فصلّی اللہ علیہ وبارك وسلم تسلیمًا کثیرا۔ اصحابِ ثلٰثہ یعنی حضرات ابوبکر صدیق، عمر فاروق اور عثمان غنی رضی اللہ تعالےٰ عنہم کے عہدِ خلافت کے دوران "اُمّیین" ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے میں تلوار لے کر ایک سیلاب کے مانند جزیرہ نمائے عرب سے نکلے اور انہوں نے ایک ربع صدی سے بھی کم میں ایران و عراق،

---

[1] چونکہ اکثر لوگوں کے اذہان سنِ عیسوی ہی کے ساتھ زیادہ مانوس ہیں، لہٰذا یہاں اسی کو پیشِ نظر رکھا جا رہا ہے!

شام و فلسطین اور مصر کے علاوہ شمالی افریقہ کے بڑے رقبے پر اسلام کا پرچم لہرا دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں تو یہ عمل رُکا رہا، لیکن بنو اُمیّہ کے دور کے آغاز کے ساتھ ہی اس سیلاب نے دوبارہ آگے بڑھنا شروع کر دیا اور تھوڑے ہی عرصے میں ایک طرف مشرق میں ترکستان، افغانستان اور سندھ تک اور دوسری طرف مغرب میں پورے شمالی افریقہ کے علاوہ سپین سمیت مغربی یورپ کا وسیع علاقہ "اُمّیین" کے زیرِ نگیں آ گیا اور عالمِ اسلام کی سرحدیں تین برّ اعظموں تک وسیع ہو گئیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب عرب افواج اندلس سے پیش قدمی کرتے ہوئے فرانس کے عین قلب تک جا پہنچی تھیں۔

آٹھویں، نویں اور دسویں صدی عیسوی کا زمانہ عربوں کے عروج کا دور ہے جس کے دوران اسلام کی علمبرداری اور عالمِ اسلام کی سیادت دونوں "اُمّیین" کی دو اہم شاخوں یعنی بنو اُمیّہ اور بنو عباس کے پاس رہیں[1] اور رُوئے ارضی کے ایک بڑے حصّے پر اُن کے دین و مذہب، اُن کے تہذیب و تمدّن، اُن کے علوم و فنون اور اُن کی شان و شوکت کا سکّہ رواں رہا۔ لیکن جیسے جیسے دنیوی جاہ و جلال میں اضافہ ہوا، جذباتِ دینی اور حرارتِ ایمانی میں کمی آتی چلی گئی اور اس طرح یہ تناور درخت اندر سے کھوکھلا ہوتا چلا گیا۔ اس اندرونی اضمحلال کے اثرات کے ظاہر ہونے میں کچھ مدّت ضرور صَرف ہوئی لیکن دسویں صدی عیسوی ہی کے

---

[1] ان میں سے بھی صرف بنو اُمیّہ کے دورِ حکومت کو خالص عرب غلبہ و اقتدار کا دور قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ بنو عباس کے دورِ حکومت میں ابتدا ہی سے اہلِ عجم کو حکومت و سلطنت کے معاملات میں فیصلہ کن دخل حاصل ہو گیا تھا اور دراصل اسی نے عرب اقتدار کے تناور درخت کو اندر ہی اندر گھن کی طرح چٹ کر لیا ورنہ خالص عرب خون میں جو حرارت تھی اور قوّتِ مقاومت موجود تھی اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ بنو اُمیّہ کی ایک شاخ جس نے اُندلس میں قدم جمائے وہ عالمِ اسلام کے قلب سے عرب قوت کے کلّی خاتمے کے بھی تین صدی بعد تک پھلتی پھولتی رہی اور اس کا خاتمہ کہیں پندرہویں صدی عیسوی میں جا کر ہوا۔

دَوران واضح ہو گیا تھا کہ عرب اپنے عالمِ پیری میں قدم رکھ چکے ہیں۔

گیارہویں صدی عیسوی کے دوران 'اُمّیّین' کا انحطاط اور زوال اپنی آخری حدوں کو پہنچ گیا اور اس طرح عالمِ اسلام کے قلب میں قوت کا ایک خلا (POWER VACUUM) پیدا ہو گیا۔

خوش قسمتی سے قوت کے دباؤ میں اس کمی (DEPRESSION) کے نتیجے میں عالمِ اسلام کی شمال مشرقی سرحدوں سے جو قبائل قلبِ اسلام کی طرف کھنچ کر آئے وہ پہلے ہی سے مسلمان ہو چکے تھے یعنی کُرد اور ترکانِ سلجوقی جنہوں نے گیارہویں صدی عیسوی کے دَوران شام، فلسطین اور مصر میں مضبوطی کے ساتھ قدم جمائے اور اس طرح عالمِ اسلام کے قلب کی حفاظت اور مدافعت کے لیے کسی قدر تازہ دم قوت فراہم ہو گئی[1]

بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی کے دوران میں اُمّتِ مسلمہ پر گویا عذابِ خداوندی کے "وعدۂ اولیٰ" کا ظہور ہوا اور ہو بہو "بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ"[2] کا نقشہ کھنچ گیا۔ چنانچہ پہلے مغرب سے صلیبی طوفان کے ریلے آنے شروع ہوئے اور ۱۰۹۹ء میں نہ صرف یہ کہ مسجدِ اقصیٰ کے ناموس کا پردہ چاک ہوا بلکہ بیت المقدس میں وہ قتلِ عام ہوا جس کا تذکرہ کرتے ہوئے مغربی مؤرخین بھی کانپ جاتے ہیں۔ پورے اٹھاسی برس تک بیت المقدس پر صلیبیوں کا قبضہ رہا۔ اس لیے کہ دولتِ عباسی تو "مرنے والی اُمّتوں کے عالمِ پیری" کا نقشہ پیش کر رہی تھی، گویا

---

[1] یہ اُسی دور کی بات ہے کہ افغان قبائل نے جنوب مشرق کا رُخ کیا اور ہندوستان پر حملے شروع کیے جس سے ہند میں مسلمانوں کی عظیم الشان مملکت کے قیام کی راہ ہموار ہوئی۔

[2] سورۃ بنی اسرائیل آیت ۵: "بھیجے ہم نے تم پر اپنے بندے سخت جنگجو، جو گھس گئے اور پھیل گئے شہروں کے مابین!"

'اُمیّین' میں تو سرے سے دَم خم باقی ہی نہ رہا تھا۔ بالآخر 'آخرین' کے تازہ و گرم خون نے مجاہدِ کبیر صلاح الدّین ایوبیؒ کی سرکردگی میں ۱۱۸۷ء میں بیت المقدس کو صلیبیوں کے قبضے سے نجات دلائی اور اس طوفان کا رُخ موڑا ——— اور پھر مشرق کی جانب سے آیا فتنۂ تاتار کا وہ طوفانِ عظیم جس نے پہلے افغانستان اور ایران کو پامال کیا اور ہر جگہ کشتوں کے پشتے لگا دیئے اور بالآخر ۱۲۵۸ء میں بغداد میں وہ تباہی مچائی کہ رہے نام اللہ کا۔ لاکھوں مسلمان تہِ تیغ ہوئے، بغداد کی گلیاں خون کی ندیاں بن گئیں اور الف لیلہ کے اس رومانوی شہر کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اور بعینہٖ وہ کیفیت پیدا ہو گئی جو کم و بیش دو ہزار سال قبل بخت نصر کے حملے سے بیت المقدس کی ہوئی تھی۔ نتیجۃً زوالِ ملکِ مستعصم امیر المومنین کے ساتھ ہی خلافتِ عباسی کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بالکل گُل ہو گیا اور نہ صرف یہ کہ اُمّتِ مسلمہ پر عذابِ خداوندی کا یہ پہلا دَور تکمیل کو پہنچا بلکہ کم از کم 'اُمّیین' کی حد تک تو "اِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ"[1] کی وعید بھی پوری ہو گئی اور وہ عالمِ اسلام کی سیادت و قیادت کے منصب سے معزول کر دیئے گئے۔ دو سال بعد یعنی ۱۲۶۰ء میں اس طوفان کا رُخ بھی 'آخرین' ہی نے پھیرا جس سے کم از کم اسلام کا مغربی بازو اس کی تاخت و تاراج سے محفوظ رہ گیا۔

بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی کے دوران عالمِ اسلام کا قلب بعینہٖ وہی نقشہ پیش کر رہا تھا جسے دیکھ کر کبھی حضرت عزیر علیہ السّلام کی زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکل گئے تھے کہ "اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا"[2]! لیکن پھر اُمّتِ مسلمہ کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کی وہی شان ظاہر ہوئی جس کا ظہور بنی اسرائیل کے حق میں ہوا تھا یعنی: "ثُمَّ

---

[1] سورۃ محمدؐ آیت ۳۸: "اگر تم پیٹھ موڑ لو گے تو (اللہ) تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو کھڑا کر دے گا!"

[2] سورۃ البقرہ آیت ۲۵۹: "کیسے زندہ کرے گا اللہ اسے، اس کی موت کے بعد!"

رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ۝[1] صرف اس فرق کے ساتھ کہ چونکہ سابقہ اُمّتِ مسلمہ ایک ہی نسل پر مشتمل تھی لہٰذا اس کی نشأۃِ ثانیہ' کا یہ عمل بھی لامحالہ اسی نسل کے اندر واقع ہوا، لیکن اُمّتِ محمّد علی صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کے معاملے میں یہ مجبوری نہ تھی، لہٰذا یہاں 'تجدیدِ ملّت' کا یہ کام 'آخرین' کی مختلف اقوام سے لے لیا گیا۔ چنانچہ نہ صرف یہ کہ خود انہی ترکانِ چنگیزی کا بڑا حصّہ اسلام لے آیا جن کے ہاتھوں عالمِ اسلام پر ہولناک تباہی آئی تھی[2] بلکہ انہی کے قبیل کے وحشی قبائل میں سے دو قبیلوں کو یہ توفیق ارزانی ہوئی کہ وہ حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے اور ان میں سے ایک یعنی ترکانِ تیموری نے ہندوستان میں ایک عظیم الشان مسلم سلطنت کی بنیاد رکھ کر عالمِ اسلام کے دائیں بازو کی توسیع کی اور دوسرے یعنی ترکانِ عثمانی نے ابتداءً ایشیائے کوچک میں قدم جماتے اور پھر رفتہ رفتہ اس عظیم الشان مسلمان مملکت کی بنیاد رکھی جس نے ایک طرف پُورے مشرقی یورپ پر اپنی بالادستی کا سکّہ جمایا، یہاں تک کہ ایک موقع پر اٹلی کے دروازوں تک پر دستک دی اور دوسری طرف شمالی افریقہ سمیت پُورے عالمِ اسلام کے قلب کی حفاظت وسیادت کی ذمّہ داری سنبھالی تا آنکہ خلافت کا بھی احیاء کیا۔ اور اس طرح گویا عالمِ اسلام کے قلب کی عظمت وسطوتِ گزشتہ پھر پُوری طرح لوٹ آئی۔ اگرچہ عربوں کے ذریعے نہیں بلکہ ترکوں کے واسطے سے!

قدرت کے کھیل بھی عجیب ہیں۔ اِدھر تو خلافتِ عثمانی کے استحکام کے ذریعے عالمِ اسلام کے قلب میں گویا ملّت کی نشأۃِ ثانیہ ہوئی اور اُدھر یورپی استعمار کے سیلاب کی صورت

---

[1] سورۃ بنی اسرائیل آیت: ۶ "پھر ہم نے تمہیں ان پر دوبارہ غلبہ عطا فرمایا اور تمہاری مدد کی مال واسباب اور بیٹوں سے اور کر دی تمہاری نفری سب سے زیادہ!"

[2] ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے ۔۔۔ پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے! (اقبالؔ)

میں اُمّتِ مسلمہ پر عذابِ الٰہی کے دوسرے اور نہایت طویل دَور کا آغاز ہو گیا جس کا اصل زور عالمِ اسلام کے میسرہ اور میمنہ کی جانب رہا۔

یہ ایک ناقابلِ تردید تاریخی حقیقت ہے کہ یورپ میں احیاء (RENAISSANCE) کا پورا عمل اسلام ہی کے زیرِ اثر شروع ہوا اور یہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے یورپ کو مشرق و مغرب کے علوم و فنون سے روشناس کرایا لیکن جیسے ہی یورپ میں بیداری پیدا ہوئی اور وہاں قوت کا دباؤ (POWER POTENTIAL) بڑھا، گویا عالمِ اسلام کی شامت آگئی۔

یورپ مشرق و مغرب دونوں اطراف سے مسلمانوں کے شکنجے میں جکڑا ہوا (LOCKED) تھا۔ لیکن مشرق میں عذاب کے وعدۂ اُولیٰ کے بعد نشاۃِ ثانیہ کا عمل ظاہر ہو چکا تھا اور عظیم سلطنتِ عثمانیہ عالمِ اسلام کے قلب کے محافظ سنتری کی حیثیت سے کھڑی تھی البتہ مغرب میں اب دولتِ ہسپانیہ "مرنے والی اُمّتوں کے عالمِ پیری" کا نقشہ پیش کر رہی تھی لہٰذا "ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات" کے مصداق یورپی استعمار کا اوّلین شکار وہی بنی اور پندرھویں صدی عیسوی کے دوران اس عظیم سلطنت کا قلع قمع ہو گیا۔ یہاں تک کہ ۱۴۹۲ء میں سقوطِ غرناطہ کے بعد تو بعینہٖ وہ صورت پیدا ہو گئی جس کا نقشہ قرآن مجید میں عذابِ استیصال کا نوالہ بننے والی قوموں کے بیان میں کھینچا جاتا ہے یعنی:

"كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا!" اور "لَا يُرٰى اِلَّا مَسَاكِنُهُمْ!"

"جیسے کہ وہ کبھی وہاں آباد ہی نہ تھے" اور "اب ان کے ویران مسکنوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا!"

۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما نے نیا بحری راستہ تلاش کیا اور اس کے فوراً بعد یورپی استعمار کا سیلاب عالمِ اسلام کے میمنہ پر ٹوٹ پڑا اور انڈونیشیا، ملایا اور ہندوستان مختلف یورپی اقوام کے استبدادی پنجوں میں جکڑے گئے اور یہ عمل جس کا آغاز سولہویں صدی عیسوی سے ہوا، اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی میں عالمِ اسلام کے دائیں بازو کی حد تک اپنے عروج (ZENITH) کو پہنچ گیا۔

اس اثنا میں دولتِ عثمانی بھی اپنے شباب کے دَور سے گزر آئی تھی اور اب اس نے بھی 'مردِ بیمار' کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ گویا عالمِ اسلام کے قلب میں آٹھ صدیوں کے بعد پھر وہی قوت کا خلا پیدا ہو گیا جو گیارہویں صدی عیسوی میں دولتِ عباسیہ کے اضمحلال کے باعث پیدا ہوا تھا۔ اور قوت کے دباؤ کی اس کمی کے باعث مغربی استعمار کا رُخ عالمِ اسلام کے قلب کی جانب مڑ گیا اور گویا اس کے اعتبار سے بھی " وَعْدُ الْاٰخِرَةِ " کا وقت آپہنچا۔

عالمِ اسلام کے قلب پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کے اس دوسرے دَور کا آغاز بیسویں صدی کے شروع میں ہو گیا تھا۔ چنانچہ پہلی عالمگیر جنگ کے خاتمے پر جب دنیا کا نیا نقشہ سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ عظیم دولتِ عثمانیہ سمٹ سمٹا کر ایشیائے کوچک میں محدود ہو گئی اور شمالی افریقہ سمیت پُورا عالمِ عرب چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم ہو کر مختلف یورپی اقوام کے براہِ راست زیرِ نگیں ہو گیا یا بالواسطہ محکومی میں آگیا اور ہوبہو وہی کیفیت پیدا ہو گئی جس کی خبر مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں دی تھی کہ: "ایک زمانہ آئے گا کہ اقوامِ عالم ایک دوسرے کو تم پر ٹوٹ پڑنے کی اس طرح دعوت دیں گی جیسے کسی دعوتِ طعام کا اہتمام کرنے والا دسترخوان چُنے جانے پر مہمانوں کو بلایا کرتا ہے!"

اس طرح بحیثیت مجموعی اُمّتِ مسلمہ پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کے دورِ ثانی کی تکمیل اس صدی کے ربعِ اوّل میں ہو گئی تھی جبکہ پُورا عالمِ اسلام مغربی استعمار کے ناپاک شکنجے میں جکڑا گیا۔ اگرچہ خاص "اُمّیین" کے حق میں " وَعْدُ الْاٰخِرَةِ " کی وہ مکمل صورت جو ــــ "لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا[1]" کے الفاظ میں بیان ہوئی تھی تقریباً نصف صدی بعد ۱۹۶۷ء میں ظاہر ہوئی جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی ایک مغضوب و ملعون قوم کے ہاتھوں

---

[1] (حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں)

ایک شرمناک اور ذلّت آمیز شکست دلوائی اور عربوں کے عہدِ تولیت کے دوران ایک بار پھر مسجد اقصیٰ کی حرمت پامال ہوئی اور بیت المقدّس ان کے ہاتھوں سے نکل کر یہود کے قبضے میں چلا گیا اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس بار یہ قبضہ کتنا طویل ہوگا!

اس داستان کا المناک ترین باب یہ ہے کہ مغربی استعمار نے اُمّتِ مسلمہ کی وحدتِ ملّی کو پارہ پارہ کر دیا اور اس صدی کے آغاز ہی میں نسلی اور علاقائی عصبیتوں کے وہ بیج مسلمان اقوام کے دلوں میں بو دیئے جو ابھی تک برگ و بار لا رہے ہیں۔ چنانچہ پہلے انہوں نے عربوں کو ترکوں کے خلاف اُبھارا۔ نتیجۃً عالمِ اسلام کا قلب دو لخت ہو گیا۔ اور وحدتِ ملّی کے علامتی

(حاشیہ صفحہ گزشتہ)

سورۃ بنی اسرائیل آیت ۷: "تو پھر جب آیا وقت دوسرے وعدے کا (تو مسلط کیے تم پر وہ لوگ) تاکہ حلیہ بگاڑ دیں تمہارا اور گھس جائیں مسجد (اقصیٰ) میں جیسے کہ گھسے تھے پہلی بار اور تباہ و برباد کر دیں جس پر بھی قابو پائیں!

لہ یہ ایک عجیب تاریخی حقیقت ہے کہ روئے ارضی کے دو قبلوں میں سے بے حرمتی اور پامالی کا معاملہ چاروں مرتبہ مسجد اقصیٰ ہی کے ساتھ ہوا جسے غلطی سے قبلۂ اوّل کہہ دیا جاتا ہے۔ واضح رہنا چاہیے کہ قبلۂ اوّل بیت اللہ اور مسجد حرام ہے (بغوائے الفاظ قرآنی "اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وَّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ") اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا جو خاص معاملہ رہا ہے وہ واقعۂ فیل سے ظاہر ہے۔ اور راقم کو تو یہی حکمت نظر آتی ہے اس میں کہ مسلمانوں کے سیاسی مرکز کو رفتہ رفتہ اس قبلۂ اوّل سے دُور سے دُور تر کیا جاتا رہا تاکہ اس اُمّت کو بھی جب عذابِ الٰہی سے واسطہ پڑے تو اس کے ساتھ خانہ کعبہ کی حرمت بھی مجروح نہ ہو۔ چنانچہ خلافتِ راشدہ ہی کے اواخر میں مرکزِ عالمِ اسلام مدینہ منوّرہ سے کوفہ منتقل ہو گیا۔ پھر وہاں سے بھی دمشق اور بغداد کی جانب نقلِ مکانی ہوتی اور بالآخر انتہائی شمال یعنی قسطنطنیہ کو عالمِ اسلام کے "دارالخلافہ" کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس طرح بیت اللہ کم از کم اغیار و اعداء کی دست برد سے ہمیشہ محفوظ رہا۔ (یہ علیحدہ بات ہے کہ اس کے تقدّس پر دو ایک مرتبہ خود ان لوگوں کے ہاتھوں کسی قدر آنچ آئی جو اپنے آپ کو مسلمان کہلواتے تھے!)

ادارے (SYMBOL) یعنی خلافت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ پھر عالمِ عرب کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں اس طرح تقسیم کیا کہ نسلی اور لسانی اشتراک کے باوجود عالمِ عرب کے کامل اتحاد کا امکان تاحال دُور دُور تک نظر نہیں آتا۔

اسی نسلی تعصب کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کے اس عذاب کا مزہ بھی امتِ مسلمہ کو چکھنا پڑا جو قرآن مجید میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے کہ "اَوْ یَلْبِسَکُمْ شِیَعًا وَّ یُذِیْقَ بَعْضَکُمْ بَأْسَ بَعْضٍ[1]" یعنی تمہیں گروہوں میں تقسیم کر دے اور پھر چکھائے ایک کو دوسرے کی جنگی قوت کا مزہ! چنانچہ اس صدی کے آغاز میں عربوں کے ہاتھوں ترکوں کا خون بہا اور پھر ۱۹۷۱ء میں بنگالی مسلمان کے ہاتھوں غیر بنگالی مسلمان کے خون کی ہولی اور جان و مال اور عزت و آبرو کی دھجیاں بکھرنے کا منظر چشمِ فلک نے دیکھا۔ فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ!

بہرحال ہمارے نزدیک 'امیین' کے لیے ۱۹۶۷ء کی ذلت اور "آخَرِیْنَ" کے ایک اہم حصے کے لیے ۱۹۷۱ء کی رسوائی کو امتِ مسلمہ کے زوال و انحطاط کی آخری حد کی حیثیت حاصل ہے اور اگرچہ "وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا[2]" کی مستقل وعید اب بھی موجود ہے۔ تاہم کیا عجب کہ اب "عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یَّرْحَمَکُمْ" ہی کی شان کا ظہور ہو اور کلنک کا کوئی اور ٹیکہ امتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی پیشانی پر نہ لگے، اگرچہ اس کا تمام تر دارومدار امت کی اپنی اصلاح پر ہے۔

---

[1] سورۃ الانعام آیت ۶۵

[2] سورۃ بنی اسرائیل آیت ۸: "بعید نہیں کہ تمہارا رب تم پر رحم فرمائے لیکن اگر تم نے پھر وہی کچھ کیا تو ہم بھی دوبارہ وہی کچھ کریں گے!"

بقول جگر مرادآبادی مرحوم ؎

چمن کے مالی اگر بنالیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی

(۲)

جہاں تک تجدیدی مساعی کا تعلق ہے واقعہ یہ ہے کہ تاریخ اسلام کا کوئی دور بھی ان سے بالکل خالی نہیں رہا اور ہر زمانے اور ہر ملک میں ایسے اولوالعزم لوگ پیدا ہوتے رہے جنہوں نے اپنے حالات کے تقاضوں کے مطابق اصلاحی اور تجدیدی کارنامے سرانجام دیئے۔ لیکن بیسویں صدی عیسوی سے قبل کی ایسی تمام کوششوں کے بارے میں ایک اصولی بات پیش نظر رہنی چاہیے اور وہ یہ کہ ان کی اصل نوعیت 'احیاءِ دین' کی نہیں بلکہ حفاظت و مدافعتِ دین کی تھی۔ اس لیے کہ ابھی اسلام کا قصرِ عظیم بالکل زمین بوس نہیں ہوا تھا اور خواہ دین کی حقیقی رُوح کتنی ہی مضمحل اور پژمردہ ہو چکی ہو بہرحال اسلام نے جو تہذیبی اور عمرانی نظام دنیا میں قائم کیا تھا اس کا ڈھانچہ برقرار (INTACT) تھا حتیٰ کہ شریعتِ اسلامی تمام مسلمان ممالک میں بالفعل نافذ تھی۔ چنانچہ تمام تجدیدی مساعی کا اصل ہدف یہ رہا کہ دین کا نظامِ عقائد و اعمال محفوظ اور اپنی اصل صورت میں قائم رہے اور خارجی و بیرونی اثرات دین کو مسخ نہ کر دیں۔

یہی وجہ ہے کہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے دور تک کے تمام مجددینِ اُمت علیہم الرحمۃ کی مساعی اکثر و بیشتر علم و فکر کے میدان ہی تک محدود رہیں اور عقائد و نظریات کی تصحیح و اصلاح ہی کو ان کے اصل ہدف کی حیثیت حاصل رہی۔ اور اس سے آگے اگر قدم بڑھا بھی تو زیادہ سے زیادہ اصلاحِ اخلاق و اعمال، تزکیۂ نفس اور تربیتِ روحانی تک۔ اس سے آگے بڑھ کر گزشتہ صدی سے قبل کسی بھی مجددِ دین کی مساعی نے سیاسی یا عسکری تحریک

کی صورت اختیار نہیں کی[1]

یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں کو سابق مجدّدین کا تجدیدی کام "جزوی" نظر آتا ہے اور انہیں حیرت ہوتی ہے کہ اُمتِ مسلمہ کی چودہ سو سالہ تاریخ میں کوئی ایک بھی "مجدّدِ کامل" پیدا نہیں ہوا۔

حالانکہ بات بالکل واضح اور سیدھی ہے کہ ابھی عمارت بالکل منہدم ہوئی ہی نہ تھی کہ بالکل نئی تعمیر کی حاجت ہوتی بلکہ صرف شکستہ اور بوسیدہ ہوئی تھی اور ضرورت ہی صرف جزوی اصلاح و استحکام کی تھی۔

یہ تو، جیسا کہ ہم مفصّل عرض کر چکے ہیں اس بیسویں صدی کے آغاز میں ہوا کہ ملّتِ اسلامی کا بوسیدہ قصر گویا دفعتہً زمین پر آرہا اور اسلام اور مسلمان دونوں اپنے زوال و انحطاط کی آخری حدوں کو پہنچ گئے اور ایک طرف کروڑوں کی تعداد میں ہونے کے باوجود مسلمانوں کی حالت حدیثِ نبوی کے الفاظ کے مطابق "غثاءُ السّیل" یعنی سیلاب کے جھاگ سے زیادہ نہ رہی اور دوسری طرف اسلام اور قرآن دونوں بھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ کے مطابق اس حال کو پہنچ گئے کہ "لَا یَبْقٰی مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اسْمُہٗ وَلَا یَبْقٰی

---

[1] اس کا ایک اہم سبب یہ تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان حکمرانوں کے خلاف "خروج" یعنی مسلح بغاوت پر نہایت سخت بندشیں عائد فرمادی تھیں اور جب تک ان کے ہاتھوں شریعتِ اسلامی کا نفاذ ہو رہا تھا اور کسی "کفرِ بواح" یعنی کھلے اور صریح کفر کی ترویج و تنفیذ نہیں ہو رہی تھی ان کے ذاتی فسق و فجور اور ظلم و جور کے باوجود ان کے خلاف مسلح بغاوت ممکن نہ تھی!

یہی وجہ ہے کہ جیسے ہی یہ صورت حال تبدیل ہوئی اور حکومت مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل کر غیر مسلم اقوام کے ہاتھوں میں آئی دفعتہً ان مساعی میں عسکریت بھی پیدا ہوگئی جس کی نہایت شاندار اور تابناک مثال خانوادۂ ولی اللّٰہی ہی کے زیر اثر برپا ہونے والی تحریک شہیدینؒ ہے۔

مِنَ الْقُرآنِ اِلَّا رَسْمُہٗ"[1] لہٰذا قانونِ فطرت کے عین مطابق احیاء کا ہمہ جہتی عمل شروع ہوگیا۔

اس احیائی عمل کے بارے میں بھی بعض بنیادی حقائق ذہن نشین رہنے چاہئیں مثلاً ایک یہ کہ یہ کوئی سادہ اور بسیط عمل نہیں ہے بلکہ اس کے متعدد گوشے ہیں جن میں سے ہر ایک میں اولوالعزم افراد اور جماعتیں برسرکار ہیں اور جو بظاہر ایک دوسرے سے جدا اور مختلف بلکہ بعض پہلوؤں کے اعتبار سے متضاد ہونے کے باوجود اس وسیع تر احیائی عمل کے اعتبار سے ایک دوسرے کے لیے باعثِ تقویت ہیں۔ دوسرے[2] یہ کہ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور ملّت اسلامی کی تجدید کا یہ کام دس بیس برس میں مکمل ہونے والا نہیں ہے بلکہ "لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ"[3] کے مصداق درجہ بدرجہ بہت سے مراتب و مراحل سے گزر کر ہی پایۂ تکمیل کو پہنچے گا، لہٰذا اس ارتقائی عمل کا ہر درجہ اپنی جگہ اہمیّت کا حامل ہے اور چاہے بعد کے مراحل سے گزر کر پہلوں کا کام بہت حقیر بلکہ کسی قدر غلط بھی نظر آئے اپنے اپنے دور کے اعتبار سے اس کی اہمیّت و وقعت سے بالکلیہ انکار ممکن نہیں۔ تیسرے یہ کہ اس ہمہ گیر تجدیدی جدّوجہد میں اگرچہ افراد کی اہمیّت اپنی جگہ مسلّم ہے[3] تاہم جماعتوں اور تنظیموں کے مقابلے میں کم تر ہے۔ پھر جماعتیں بھی تحریکوں کی وسعت میں گم ہوجاتی ہیں اور بالآخر تمام تحریکیں بھی اس وسیع احیائی عمل کی پہنائیوں میں گم ہوجاتی ہیں جو ان سب کو محیط ہے۔

ماضی میں ان حقائق کے پیشِ نظر نہ رہنے کے باعث بہت سے

---

[1] "ایک زمانہ وہ آئے گا کہ اسلام میں سے سوائے اس کے نام کے کچھ باقی نہ رہے گا اور قرآن میں سے بھی سوائے اس کے رسم الخط کے اور کچھ نہ بچے گا۔" (مشکوٰۃ شریف، کتاب العلم)

[2] سورۃ الانشقاق آیت ۱۹: "تم لازماً چڑھو گے سیڑھی بہ سیڑھی۔"

[3] بقول علامہ اقبالؔ ؎

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر ہر فرد ہے ملّت کے مقدر کا ستارا

لوگوں کے دلوں میں "مہدیٔ موعود" یا "مجددِ کامل" بننے کا شوق پیدا ہوتا رہا ہے جس کے نتیجے میں طرح طرح کے فتنے اُٹھتے رہے ہیں اور اچھی بھلی تعمیری کوششوں کا رُخ تخریب کی جانب مڑ جاتا رہا ہے!

اِس احیائی عمل کا اولین مرحلہ مسلمان اقوام کا مغربی استعمار کے براہِ راست تسلّط سے نجات کا حصول تھا جو بحمد اللہ گزشتہ تیس چالیس سال کے دَوران تقریباً مکمل ہو چکا ہے۔ اور اگرچہ اب بھی ہم مغرب کی علمی و فکری اور تہذیبی و ثقافتی غلامی میں مبتلا ہیں اور اقوامِ مغرب کی سائنسی و تکنیکی بالادستی کے باعث بہت سے پہلوؤں سے ان کے دست نگر بھی ہیں تاہم خدا کا شکر ہے کہ ایک قضیۂ فلسطین سے قطع نظر اور صرف کشمیر اور اریٹریا کے علاوہ پورے کرۂ ارضی پر مسلم اکثریت کا کوئی علاقہ براہِ راست غلامی و محکومی کی لعنت میں گرفتار نہیں رہا۔

خالص اصولی و نظریاتی اور تصوّریت پسندانہ (IDEALISTIC) نقطۂ نظر سے تو "مسلمان اقوام" کی اصطلاح ہی قطعاً غلط ہے۔ اس لیے کہ ازرُوئے قرآن و حدیث مسلمانوں کی حیثیت ایک جماعت یا اُمّت یا حزب کی ہے نہ کہ قوم کی۔ اور وہ ایک ناقابلِ تقسیم وحدتِ ملّی میں منسلک ہیں جس میں تعدّد و تکثّر کا امکان ہی موجود نہیں کہ اقوام کا لفظ صحیح قرار دیا جا سکے۔ لیکن واقعیت پسندانہ (REALISTIC) نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے ایک جماعت یا اُمّت یا حزب کا کردار (ROLE) تو بہت پہلے ترک کر دیا تھا اور بالفعل ایک قوم ہی کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ البتہ وحدتِ ملّی کا تصوّر اس صدی کے آغاز تک برقرار تھا۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، اس صدی کے ربعِ اوّل کے دَوران مغربی استعمار کے ہتھکنڈوں نے اسے بھی ختم کر کے رکھ دیا تھا اور اس وقت فی الواقع رُوئے ارضی پر کوئی ایک اُمّتِ مسلمہ آباد نہیں ہے بلکہ بہت سی مسلمان اقوام آباد ہیں۔

اِسی طرح خالص تصوّریت پسندانہ نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ع "نشۂ مے کو تعلق نہیں

پیمانے سے" کے مصداق مسلمانوں کی آزادی اور خود مختاری کا احیائے اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن واقعیت پسندانہ نگاہ سے دیکھئے تو مستقبل کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جا سکتا، ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی علمبرداری کی سعادت کسی بالکل ہی نئی قوم کے حوالے فرما دے اور "یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ" کی شان دوبارہ ظاہر ہو ـــــ لیکن بحالاتِ موجود توسع "کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے، جام رہے" کے مصداق اسلام کا مستقبل موجودہ مسلمان اقوام ہی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور دونوں باہم لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اندریں حالات، مسلمان اقوام کا آزادی و خود اختیاری کی نعمت سے ہمکنار ہونا یقیناً احیائے اسلام ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے اور جن تحریکوں کے ذریعے یہ مشکل مرحلہ سر ہوا ہے ان کی سعی بھی اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ہی کی جدّوجہد کا جزو قرار پائے گی۔ رہا یہ شبہ کہ ان میں سے اکثر کے قائدین اور زعماء کا دین و مذہب کے ساتھ کوئی واقعی اور عملی تعلق نہ تھا تو اسی کا جواب ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظِ مبارکہ میں کہ "اِنَّ اللّٰہَ یُؤَیِّدُ الدِّیْنَ بِالرَّجُلِ الْفَاجِرِ" (بخاری: کتاب الجہاد) واقعہ یہ ہے کہ اللہ کے کام بہت نرالے ہیں اور اس کی تدبیریں بہت لطیف اور مخفی اور اس کے منصوبے بہت طویل الذّیل اور وسیع الاطراف ہوتے ہیں اور وہ بسا اوقات فُسّاق و فُجّار سے اپنے دین کی خدمت لے لیتا ہے۔ "وَاللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰٓی اَمْرِہٖ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝

اس ضمن میں ایک اور حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اگرچہ مختلف مسلمان ممالک میں حصولِ آزادی کی تحریکوں کی تقویت کے لیے جن علاقائی یا نسلی عصبیتوں کو استعمال (INVOKE) کیا گیا، انہیں بھی خاص اصولی اور نظری اعتبار سے اسلام کے نظامِ فکر کے ساتھ سوائے تباین و تضاد کے کوئی نسبت حاصل نہیں ہے، لیکن عالمِ واقعہ میں اس کے سوائے کوئی چارۂ کار موجود نہ تھا، اس لیے کہ اسلام کے ساتھ مسلمانوں کا ذہنی و قلبی رشتہ اتنا قوی نہ رہا تھا کہ اسے کسی جاندار اور فعّال تحریک کی اساس بنایا جا سکتا اور حصولِ استقلال کے لیے جس مؤثر مزاحمت (EFFECTIVE)

(RESISTANCE) کی ضرورت ہوتی ہے اس کی بنیاد خیالی یا جذباتی نہیں بلکہ حقیقی اور واقعی اساسات (CONCRETE GROUND) ہی پر رکھی جاسکتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر ترک نیشنلزم کا جذبہ فوری طور پر بیدار نہ ہوگیا ہوتا تو شاید آج ترکی کا نام ونشان بھی صفحۂ ارضی پر موجود نہ ہوتا۔ اسی طرح اسلام سے جتنا کچھ حقیقی اور واقعی تعلق اس وقت مسلمانانِ عرب کو ہے وہ کسے معلوم نہیں، اندریں حالات عرب نیشنلزم ہی یورپی سامراج کے چنگل سے نکلنے کی جدّوجہد کے لیے واحد موجود (THE ONLY AVAILABLE) بنیاد بن سکتا تھا اور ایک وقتی ضرورت اور دفاعی تدبیر کی حد تک اس کے استعمال میں کوئی قباحت بھی نہیں ہے، بشرطیکہ اسے نظامِ فکر کی مستقل اساس کے طور پر قبول نہ کرلیا جائے اور حصولِ آزادی کے عبوری مقصد کی تکمیل کے بعد صحیح اسلامی فکر اور وحدتِ ملّی کے شعور واحساس کو اُجاگر کیا جائے!

اس پس منظر میں دیکھیے تو تحریکِ پاکستان کا معاملہ بالکل منفرد نظر آتا ہے۔ برّصغیر کے مسلمان بھی اگر برطانوی استعمار سے نجات حاصل کرنے کے لیے ہندی قومیّت کی اساس پر غیر مسلموں کے ساتھ اشتراکِ عمل کرتے تو اس کے لیے بھی وجہ جواز موجود تھی[1] لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل وکرم ہے کہ یہاں کے مخصوص حالات کے باعث مسلمانانِ ہند نے اپنی سیاسی جدّوجہد کا آغاز ہی "مسلم قومیّت" کی اساس پر کیا جس کے نتیجے میں وہ ملک وجود میں آیا جو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرح جو اپنا نام "سلمان ابن اسلام" بتایا کرتے تھے، صرف اور صرف "فرزندِ اسلام" قرار دیا جاسکتا ہے اور جس کے قیام اور بقا کے لیے کوئی وجہ جواز سوائے اسلام کے موجود نہیں ہے۔ گویا پاکستان ع "خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ" کے مصداق

---

[1] چنانچہ جمعیت علمائے ہند کی سیاسی جدّوجہد اسی اصول پر مبنی تھی، بلکہ مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی خودنوشت سوانح "نقشِ حیات" میں تو ثابت کیا ہے کہ خود مجاہدِ کبیر حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ مسلمانانِ پنجاب کو "سکھاشاہی" سے نجات دلانے کے بعد اسی اساس پر انگریزوں کے خلاف تحریک چلانے کا ارادہ رکھتے تھے!

اپنی پیدائش (GENESIS) اور ہیئت ترکیبی کے اعتبار سے تمام مسلمان ممالک سے ایک قدم آگے ہے اور دوسروں کو ع "قبائل ہوں ملت کی وحدت میں گم" کا جو کٹھن مرحلہ ابھی طے کرنا ہے وہ کم از کم اصولی اور نظری اعتبار سے یہاں پہلے ہی سے طے شدہ ہے!

مسلمانانِ ہند کی سیاسی جدّوجہد کو اس رُخ پر ڈالنے والے اسباب و عوامل میں سلبی و منفی طور پر سب سے زیادہ دخل ہندوؤں کی روایتی تنگ نظری اور تنگ دلی اور اس سے بھی بڑھ کر مسلمانوں سے اپنی "ہزار سالہ شکست کا انتقام" لینے کے اُس جذبے کو حاصل ہے جو اُن کے سینوں میں کھولتے ہوئے لاوے کی طرح پک رہا تھا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو گویا ان کا یہ طرزِ عمل بھی اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے ممدّ و معاون بن گیا اور ہم اپنے سابق ابنائے وطن کی خدمت میں بجا طور پر عرض کر سکتے ہیں کہ ؎

تو نے اچھا ہی کیا دوست سہارا نہ دیا
مجھ کو لغزش کی ضرورت تھی سنبھلنے کے لیے!

مثبت اسباب کے ضمن میں ایک تو یہ حقیقت پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ مسلمانانِ ہند کے دلوں میں پہلے بھی جذبۂ ملّی باقی تمام دنیا کے مسلمانوں سے زیادہ تھا جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ تنسیخِ خلافت (ABOLITION OF CALIPHATE) پر جس قدر شدید ردِّ عمل یہاں ظاہر ہوا اس کا عُشرِ عشیر بھی کہیں اور نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ ایک وقت تھا کہ برّصغیر کے ہندوؤں اور مسلمانوں سب کی مشترک سیاسی جدّوجہد کا عنوان ہی 'تحریکِ خلافت' بن گئی تھی ـــــ اور دوسرے یہ کہ اس خطّے میں علّامہ اقبال مرحوم ایسی عظیم شخصیت پیدا ہوئی جس کی انتہائی پُر درد و پُر تاثیر حُدی خوانی نے قافلۂ ملّی کو خوابِ غفلت سے بیدار کر دیا اور مسلمانانِ ہند کو جذبۂ ملّی سے سرشار کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ پُوری امّتِ مسلمہ پر علامہ مرحوم کا ایک بہت بڑا احسان ہے اور بلاشبہ ان کی ملّی شاعری کو اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور تجدید و احیائے دین کی وسیع الاطراف جدّوجہد میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔

اور اس پس منظر (CONTEXT) میں دیکھا جائے تو عالمی اسلامی سربراہی کانفرنس کا پاکستان اور خاص طور پر اس شہر لاہور میں انعقاد بہت معنی[1] خیز ہے، جہاں قریباً ثلث صدی قبل قرار داد پاکستان بھی منظور ہوئی تھی اور جہاں دورِ حاضر میں قافلۂ ملّتِ اسلامیہ کا وہ سب سے بڑا حدی خواں بھی مدفون ہے جو آخری دم تک یہ صدا لگاتا رہا کہ:

بیا تا کارِ ایں اُمّت بسازیم قمارِ زندگی مردانہ بازیم
چناں نالیم اندر مسجدِ شہر دِلے در سینۂ مُلّا گدازیم

اس ہمہ جہتی احیائی عمل کا دوسرا اہم گوشہ وہ ہے جس میں علمائے کرام کی مختلف جماعتیں اور تنظیمیں سرگرم کار اور اپنے اپنے مخصوص انداز میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں مصروف و مشغول ہیں۔

اور واقعہ یہ ہے کہ اس پہلو سے بھی برّصغیر ہند و پاک کو پورے عالمِ اسلام میں ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ چنانچہ علماء دین کو جس قدر اثر (HOLD) یہاں کے مسلمان عوام پر حاصل ہے وہ دنیا میں کہیں اور نظر نہیں آتا اور راسخ العقیدہ اسلام (ORTHODOX ISLAM) جتنی مضبوط جڑیں یہاں رکھتا ہے کہیں اور نہیں رکھتا[2] حتّٰی کہ جزیرہ نمائے عرب بھی، جہاں اس صدی کے وسط تک محمد ابن عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ کی تجدیدی مساعی کے گہرے اثرات قائم رہے ہیں اب اس معاملے میں بہت پیچھے رہ گیا ہے!

---

[1] خیال رہے کہ یہ مضمون اکتوبر ۷۴ء میں لکھا گیا تھا۔

[2] ۶۰ء میں جو ایجی ٹیشن ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کی کتاب (ISLAM) کے خلاف ہوا تھا اور اب جو تازہ معجزہ قادیانی مسئلے کے حل کی صورت میں صادر ہوا ہے وہ اس کے منہ بولتے ثبوت ہیں!

اس کی وجہ بھی بادنیٰ تامّل سمجھ میں آجاتی ہے اور وہ یہ کہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ایسی جامع شخصیت گزشتہ تین سو سالوں کے دوران میں پورے عالمِ اسلام میں پیدا نہیں ہوئی اور انہوں نے مسلمانوں کی توجہ علمِ دین کے اصل سرچشموں یعنی قرآن اور حدیث کی جانب منعطف کرانے کے ساتھ ساتھ فکرِ اسلامی کی تدوینِ نو کا جو عظیم الشان کارنامہ سرانجام دیا اُسی کا نتیجہ ہے کہ یہاں دین اور رجالِ دین کی ساکھ ازسرِنو مضبوط ہوگئی۔

اس ضمن میں یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ علماءِ دین کی مساعی میں اصل زور (EMPHASIS) دورِ حاضر میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور تجدید و احیائے دین کے تقاضوں کو پورا کرنے کے بجائے دین کے نظامِ عقائد و اعمال کی حفاظت و مدافعت ہی پر ہے۔ اس طرح گویا ظاہری اعتبار سے ان کی خدمات کو سابق مجددینِ اسلام کی مساعی کے ساتھ ایک نوع کے تسلسل کی نسبت حاصل ہے۔ اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے بعض اہم فرق بھی ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ جب سے اجتہاد کا دروازہ بند ہوا اور تقلیدِ جامد کا دور دورہ ہوا اور تشتّت و انتشار اور فرقہ پرستی و گروہ بندی نے پاؤں جمالیے، ہر فرقے کے علماءِ کرام دین کے نظامِ عقائد و اعمال کی خاص اُسی صورت کی حفاظت و مدافعت پر سارا زور صرف کر رہے ہیں جو اُن کے مخصوص فرقے یا گروہ کے نزدیک معتبر و مستند ہے۔ جس سے فرقہ بندی کی جڑیں مضبوط ہوتی چلی جارہی ہیں۔ دوسرے چونکہ انہوں نے علومِ جدیدہ اور دورِ حاضر کے افکار و نظریات کا مطالعہ اس طرح براہِ راست اور بالاستیعاب نہیں کیا جس طرح اپنے اپنے دور میں امام غزالی اور امام ابن تیمیہ رحمہما اللہ نے کیا تھا لہٰذا وہ دورِ حاضر میں حفاظت و مدافعتِ دین کے اصل تقاضوں کو بھی صحیح طور پر پورا کرنے سے قاصر ہیں۔

لہٰذا دورِ حاضر میں علماءِ دین کی حیثیت دین کے جہاز کو آگے بڑھانے والی قوت فراہم کرنے والے انجن کی تو نہیں ہے البتہ کم از کم برّصغیر پاک و ہند کی حد تک ایک ایسے بھاری لنگر کی ضرور ہے جو اس کشتی کو غلط رُخ پر بڑھنے سے روکنے کی خدمت بہرحال سرانجام

دے سکتا ہے۔ اور فی زمانہ یہ بھی ایک اہم خدمت ہے!

برصغیر میں اس سلسلے میں ایک اہم مقام اور مرتبہ دیوبندی مکتب فکر کو حاصل ہے جو امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے 'فکر' کا نہ سہی 'علم' کا وارث ضرور ہے۔ اور جس کی کوکھ سے دینی مدرسوں اور دارالعلوموں کے ایک عظیم سلسلے کے علاوہ ایک عظیم تحریک بھی برآمد ہوئی ہے جس نے راسخ العقیدہ اسلام کی جڑوں کی آبیاری کے ساتھ ساتھ توجہات کو حقائق ایمانی پر مرتکز (FOCUS) کر دیا اور جس کے زیر اثر کم از کم ایسے لوگ ضرور دین سے قریب ہو رہے ہیں جن کے اذہان فکری و نظری اشکالات سے خالی ہوتے ہیں اور جن کے قلوب میں نیکی کا ایک جذبہ خواہ نیم خوابیدہ حالت ہی میں سہی بہرحال موجود ضرور ہوتا ہے۔ ہماری مراد 'جماعت تبلیغی' سے ہے جس نے اس دور میں دین و مذہب کے نام پر ایک عظیم حرکت عالم اسلام ہی نہیں، دیار غیر میں بھی برپا کر دی ہے اور جس کے زیر اثر عوامی سطح ہی پر سہی بہرحال 'تجدید ایمان' کی ایک تحریک بالفعل برپا ہو گئی ہے اور جسے بلاشبہ زیر بحث 'ہمہ جہتی احیائی عمل' میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔

اس 'ہمہ جہتی احیائی عمل' کا تیسرا اور اہم ترین گوشہ وہ ہے جس میں وہ جماعتیں اور تنظیمیں برسرکار ہیں جو قائم ہی خالص احیائی مقاصد کے تحت ہوئیں اور جنہیں اب اس احیائی عمل کے اعتبار سے گویا مقدمۃ الجیش کی حیثیت حاصل ہے۔ مختلف مسلمان ممالک میں ایسی جماعتیں اور تنظیمیں مختلف ناموں کے تحت کام کرتی رہی ہیں لیکن "ہے ایک ہی جذبہ کہیں واضح کہیں مبہم" اور "ہے ایک ہی نغمہ کہیں اونچا کہیں مدھم" کے مصداق ان کی حیثیت ایک ہی تحریک کے تحت کام کرنے والی مختلف تنظیمی ہیئتوں کی ہے۔

ان جماعتوں میں سے اگرچہ ایک دور میں جوش اور جذبے کی شدت اور اثر و نفوذ کی وسعت کے اعتبار سے مصر کی 'الاخوان المسلمون' توجہات اور اُمیدوں کا مرکز بن گئی تھی۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ احیائی عمل کے اس گوشے میں بھی اصل اہمیت برصغیر ہند و پاک ہی کو حاصل ہے۔

برصغیر میں اس تحریکِ احیائے دین کے مؤسس اوّلین اور داعیٔ اوّل کی حیثیت مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کو حاصل ہے جنہوں نے اس صدی کے بالکل اوائل میں 'الہلال' اور 'البلاغ' کے ذریعے "حکومتِ الٰہیہ" کے قیام اور اس کے لیے ایک "حزب اللہ" کی تاسیس کی پُرزور دعوت پیش کی۔ مولانا کے مخصوص طرزِ نگارش اور اندازِ خطابت نے خصوصاً تحریکِ خلافت کے دوران میں ان کی شہرت کو برصغیر کے طول و عرض میں پھیلایا اور ان کی دعوت نے لاکھوں مسلمانوں کے دلوں کو مسخر کر لیا۔ لیکن اس کے بعد خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کس سبب سے انہوں نے اس عظیم مشن کو خیرباد کہہ کر انڈین نیشنل کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی اور باقی پوری زندگی پوری یکسوئی اور کمال مستقل مزاجی کے ساتھ ہندوستان کی نیشنلسٹ سیاست کی نذر کر دی۔

مولانا کی زندگی کے اس عظیم انقلاب کے ممکن اسباب میں ان کی حد سے بڑھی ہوئی ذہانت کو بھی شمار کیا جا سکتا ہے کہ ع "اے روشنیٔ طبع تو برمن بلاشدی"! مولانا بلاشبہ عبقری تھے اور عبقری انسان زیادہ عملی نہیں ہوا کرتے۔ اس کا کچھ سراغ ان کے اس جملے میں بھی ملتا ہے کہ "ہم بیک وقت گلیمِ زہد اور ردائے رندی اوڑھنے کے جرم کے مرتکب ہیں"۔ اور ایک خیال جو زیادہ قرینِ قیاس ہے یہ بھی ہے کہ مولانا کی حیثیت ایک سکہ بند اور مسلّم عالمِ دین کی نہ تھی اور اس وقت تک مسلمانانِ ہند پر علماء کی گرفت بہت مضبوط تھی لہٰذا مولانا کو گویا راستہ بند نظر آیا۔ اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب کے ذریعے ہم تک پہنچی اور جس کا حاصل یہ ہے کہ دس سال کے عرصے میں[1] اپنے پیشِ نظر مقصد کے لیے تمہیدی

---

[1] 'الہلال' کا اجراء ۱۹۱۲ء میں ہوا تھا!

مراحل کی تکمیل کے بعد اپریل ۱۹۲۲ئہ میں مولانا نے دہلی میں منعقدہ جمعیت علمائے ہند کی کانفرنس میں مفتی کفایت اللہ مرحوم اور مولانا احمد سعید مرحوم کے تعاون سے اگلا قدم اُٹھانے کی سکیم بنائی چنانچہ پہلے خود انہوں نے تقریر کی اور اپنے جوشِ خطابت سے حاضرین کے جذبۂ عمل کو اُبھارا ہی نہیں للکارا۔ اور پھر مولانا احمد سعید صاحب نے تقریر کی کہ حضرت شیخ الہندؒ کی رحلت کے بعد سے مسلمانانِ ہند کی قیادت کی مسند خالی ہے۔ اور اب جو مرحلہ درپیش ہے اُس میں 'شیخ الہند' سے بھی بڑھ کر 'امام الہند' کی ضرورت ہے۔ اب غور کرو اور اس کے لیے کسی موزوں شخص کو تلاش کرکے اس کے ہاتھ پر بیعت کرو اور جد وجہد کا آغاز کر دو لیکن اللہ تعالےٰ کو کچھ اور ہی مطلوب تھا۔ چنانچہ علاّمۃ الہند مولانا معین الدین اجمیری اُٹھے اور انہوں نے براہِ راست مولانا آزاد کو خطاب کرکے ان الفاظ سے اپنی تقریر کا آغاز کیا کہ "ایاز قدرِ خود بشناس!" جس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پوری تقریر میں کیا کچھ ہوگا۔ بہر حال اس سے دِل شکستہ اور دل برداشتہ ہو کر مولانا اس کام ہی سے دست کش ہو گئے اور اس کے فوراً بعد ہی انہوں نے کانگریس میں شمولیت اختیار کرلی!

اس طرح مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم تو میدان چھوڑ گئے لیکن ان کی زوردار دعوت کی گھن گرج سے مسلم انڈیا کی فضائیں دیر تک گونجتی رہیں۔ اور پھر کم وبیش دس ہی سال بعد ایک باہمّت نوجوان[۱] نے مولانا کو ان کی زندگی ہی میں مرحوم قرار دے کر ان کے ترک کردہ مشن کو اختیار کرنے کے عزمِ مصمّم کے ساتھ ان کی تفسیر 'ترجمان القرآن' ہی کے ہم نام ماہنامے کی ادارت سنبھالی اور اس کے ذریعے اُسی 'حکومتِ الٰہیہ' کے قیام کا نصب العین اور "تجدید واحیائے دین" کی سعی کا ایک نقشہ مسلمانانِ ہند کے سامنے پیش کرنا شروع کردیا۔

اس نوجوان میں مولانا مرحوم کی بہ نسبت جوش کم تھا، ہوش زیادہ، ذہانت وفطانت

۱؎ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی مؤسّس جماعت اسلامی۔

قدرے کم تھی لیکن اسی نسبت سے محنت و مشقت کا مادّہ بہت زیادہ تھا۔ لہٰذا اس نے پہلے چھ سات برس تک پورے صبر و استقلال کے ساتھ خالص انفرادی طور پر کام جاری رکھا۔ کچھ عرصہ 'دارالاسلام' کے نام سے ایک ادارے کے تحت کام کیا اور بالآخر ۱۹۴۱ء میں 'جماعتِ اسلامی' کے نام سے ایک جماعت کی بنیاد رکھ دی اور ایک منظم جدوجہد کا آغاز کر دیا۔

جماعت کے قیام سے قبل اس نوجوان نے پہلے انڈین نیشنل کانگریس میں شامل یا اس کے حلیف علماء کے موقف پر شدید تنقید کی اور اپنے زورِ استدلال سے ان کے طریق کار کا انجامِ کار کے اعتبار سے اسلام اور مسلمان دونوں کے حق میں سخت مُضر ہونا ثابت کر دیا۔ پھر مسلمانوں کی قومی سیاست پر مدلّل تنقید کی اور اسلام کے بلند ترین تصوّریت پسندانہ موقف کے تقابل سے اس کا 'خلافِ اسلام' ہونا ثابت کیا اور خود اسی بلند ترین تصوریت پسندانہ سطح (HIGHEST IDEALISTIC LEVEL) پر اپنی جماعت کی اساس رکھ دی۔

چنانچہ جماعت اسلامی کے اساسی موقف کا خلاصہ یہ قرار پایا کہ:

۱۔ اسلام مذہب نہیں دین ہے اور اس کی اصل حیثیت ایک کامل نظریۂ حیات اور مکمل نظامِ زندگی کی ہے جو اپنی عین فطرت کے تقاضے کے طور پر اپنا کلّی نفاذ اور کامل غلبہ چاہتا ہے۔

۲۔ عبادت صرف مراسمِ عبودیت کا نام نہیں، بلکہ اس نظام کی کلّی اطاعت کا نام ہے۔

۳۔ مسلمان قوم نہیں، اُمّتِ مسلمہ اور حزب اللہ ہیں۔ اور ان کی اصل حیثیت ایک نظریاتی جماعت (IDEALISTIC PARTY) کی ہے جس کا اوّلین مقصد اپنے نظریات کے مطابق انقلاب برپا کرنا اور اپنے نظامِ زندگی کو بالفعل قائم کرنا ہے۔

۴۔ دنیا کے موجودہ غیر مسلموں کی ایک عظیم اکثریت قانوناً تو کافر ہے لیکن حقیقتاً کافر نہیں۔ اس لیے کہ ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش ہی نہیں کی گئی کہ ان کے انکار یا ردّ کر دینے کا سوال پیدا ہو۔

۵۔ اسی طرح دنیا کے موجودہ مسلمانوں کی ایک عظیم اکثریت بھی صرف قانونی اور نسلی، مسلمانوں پر مشتمل ہے نہ کہ حقیقی مسلمانوں پر۔ اس لیے کہ نہ ان کے قلوب و اذہان میں اسلام کی نظریاتی و اعتقادی اساسات راسخ ہیں، نہ ان کے عمل میں اسلامی قانون کی پابندی اور شریعت کا التزام ہی پایا جاتا ہے۔

۶۔ مسلمانوں کے قومی مفادات کے تحفظ اور ان کے سیاسی حقوق کی حفاظت یا ان کی آزادی اور خود اختیاری کے حصول کی جدّوجہد کا اسلام کی نشأۃِ ثانیہ یا احیائے دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۷۔ 'کرنے کا اصل کام' یہ ہے کہ اوّلاً ——— بلا لحاظِ مذہب و ملّت پوری نوعِ انسانی کو بندگیٔ ربّ کی طرف پکارا جائے اور اسلام کی نظریاتی اساسات کو شعوری طور پر قبول کرنے کی دعوت دی جائے اور ——— پھر سابق غیر مسلموں یا نسلی مسلمانوں میں سے جنہیں بھی اللہ تعالیٰ اسلام کو شعوری طور پر قبول کرنے کی توفیق عطا فرمادے ——— ان کی قوتوں کو ایک ہیئتِ تنظیمی کے تحت مجتمع کر کے غلبۂ دینِ حق یا 'حکومتِ الٰہیہ'[1] کے قیام کی منظّم جدّوجہد کی جائے۔

۸۔ اس جدّوجہد میں اوّلین اہمیت علمی و فکری انقلاب کو حاصل ہے پھر عملی و اخلاقی تبدیلی اور معاشرتی اصلاح کو۔ نظامِ حکومت کی تبدیلی کا مرحلہ ان سب کے بعد آتا ہے۔

ہمارے نزدیک اس موقف میں انتہا پسندی کی شدّت تو موجود ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کا ٹھیٹھ نظریاتی اور اصولی موقف یہی ہے۔ اور دوسری احیائی مساعی کے

---

[1] واضح رہے کہ جب جماعت اسلامی کے قیام کے کچھ عرصہ بعد مولانا اصلاحی کا قرآنی فکر بھی اس تحریک کے ساتھ آشامل ہوا تو 'حکومتِ الٰہیہ' کی اصطلاح سرے سے متروک ہو گئی اور اس کی جگہ 'شہادتِ حق' اور 'اقامتِ دین' کی خالص قرآنی اصطلاحوں نے لے لی!

ساتھ ساتھ اس خالص اصولی اساس پر کسی تحریک کا اٹھنا وقت کی اہم ضرورت تھی جو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے ہاتھوں پوری ہوئی اور ہم داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے اس پر کہ مولانا موصوف اور ان کے رفقائے کار حالات کی سخت نامساعدت کے علی الرغم اور ہر طرح کے طعن و طنز اور تمسخر و استہزاء کے باوجود مسلسل چھ سال اس موقف پر ڈٹے رہے۔ نتیجۃً عزیمت کی نہایت اعلیٰ مثالیں چشم فلک نے دیکھیں اور "تاریخ دعوت و عزیمت" میں ایک نہایت درخشاں باب کا اضافہ ہو گیا۔ اس طرح گویا وہ کام جسے احیائے اسلام کے راست اقدام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور جس کا ابتدائی خاکہ (BLUE PRINT) مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے تیار کیا تھا، عملاً مولانا مودودی کے ہاتھوں شروع ہوا۔

لیکن افسوس کہ ع "خوش درخشید و لے شعلۂ مستعجل بود!" کے مصداق مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی اس بلند و بالا موقف پر زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکے اور ۱۹۴۷ء میں جیسے ہی مسلمانانِ ہند کی قومی تحریک کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور پاکستان کے نام سے ایک آزاد مسلمان ریاست قائم ہوئی اور متعدد اسباب سے ایک توقع سی نظر آئی کہ یہاں اسلام کے نام پر ایک سیاسی تحریک چلائی جا سکتی ہے، انہوں نے اپنے اصولی موقف کو ترک کر کے بغیر اس کے کہ کوئی علمی و فکری انقلاب آیا ہو یا اخلاقی و عملی تبدیلی معاشرے میں برپا ہوئی ہو، نظامِ حکومت کی اصلاح کے لیے عملی سیاسیات کے میدان میں قدم رکھ دیا ——— لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا وہ توقع تو موہوم سے موہوم تر ہوتی چلی گئی البتہ سیاست کی سنگلاخ وادی میں یہ تحریک "وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ"[1] کے مصداق پست تر موقف اختیار کرنے پر مجبور ہوتی چلی گئی۔

پہلے خیال تھا کہ خالص اسلام کے نام اور محض اپنے زورِ بازو کے بل پر یہ مرحلہ سر ہو جائے گا لہٰذا کمال شانِ استغناء کے ساتھ دوسری سیاسی جماعتوں کی اشتراکِ عمل کی پیش کشوں کو ٹھکرا دیا

---

[1] سورۃ الاعراف آیت ۱۷۶: "لیکن وہ تو زمین ہی میں دھنس کر رہ گیا!"

گیا۔ جب پنجاب کے ۱۹۵۱ء کے الیکشن کے بعد یہ مغالطہ دُور ہوا تو خیال ہوا کہ مذہب کے نام پر دوسری مذہبی جماعتوں کے تعاون سے یہ مہم سر کی جائے۔ پھر جب معلوم ہوا کہ یہ بھی ممکن نہیں اور چڑھائی اتنی سخت ہے کہ گاڑی اس سیکنڈ گیئر میں بھی آگے نہیں بڑھ سکتی تو گویا ٹاپ گیئر آزمایا گیا اور ایک درجہ اور نیچے اُتر کر محض جمہوریت کے نام پر مذہبی و لادینی تمام عناصر کے ساتھ مل کر آگے بڑھنے کی کوشش کی گئی۔

سابق صدر ایوب مرحوم کا پورا گیارہ سالہ دورِ حکومت اسی "بحالیٔ جمہوریت" کی مہم کی نذر ہو گیا۔ لیکن جب اُن کے اقتدار کی عمارت گری تو اس کے ملبے سے کچھ اور ہی برآمد ہو گیا!

ہمارے پیشِ نظر اس وقت نہ تو تاریخ نگاری ہی ہے نہ جماعتِ اسلامی کے مستقبل کے بارے میں کوئی پیش گوئی یا قیاس آرائی، نہ ہم اس وقت اس بحث ہی میں اُلجھنا چاہتے ہیں کہ مولانا مودودی کے اس 'انقلابِ حال' کے اسباب کیا تھے (اس پر ہم اپنی تالیف "تحریک جماعتِ اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ" میں مفصل بحث بھی کر چکے ہیں) ہمیں اس معاملے کے جس پہلو سے اصل دلچسپی ہے وہ یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی کے اس 'انتقالِ موقف' سے احیائے اسلام کے ہمہ جہتی عمل میں ٹھیٹھ اصولی اسلامی تحریک کی جگہ پھر خالی ہو گئی اور اس مہیب خلا کو پُر کرنے کی کوئی صورت تاحال پیدا نہیں ہوئی جو اپنے پیش رو مولانا آزاد اور ان کی جماعت حزب اللہ کی طرح مولانا مودودی اور ان کی قائم کردہ جماعت اسلامی نے جیتے جی مرحوم ہو کر پیدا کیا ہے۔ چنانچہ اب اگرچہ سیاسی و قومی سطح پر بھی احیائی عمل جاری ہے اور علماء کرام کی سرگرمیاں بھی اپنے اپنے رنگ میں تیز سے تیز تر ہو گئی ہیں، احیائی عمل کا یہ تیسرا اور اہم ترین گوشہ ویران و سنسان پڑا ہے!

جماعتِ اسلامی کے موقف میں یہ تبدیلی اصولاً ۱۹۴۷ء ہی میں پیدا ہو گئی تھی لیکن کم و بیش دس سال یہ اپنی قوت کے زور میں بڑھتی چلی گئی اور اس تبدیلی کا احساس بھی لوگوں

کو نہیں ہوا لیکن ۵۶-۱۹۵۵ء میں جماعت میں اس احساس نے زور پکڑا اور طریق کار کے بارے میں ایک اختلافِ رائے ظاہر ہوا جس نے ایک ہنگامے کی صورت اختیار کر لی نتیجۃً جماعت کے 'اکابر' کی اکثریت چند 'اصاغر' سمیت جماعت سے کٹ گئی۔ اُن 'اصاغر' میں سے ایک ان سطور کا راقم بھی ہے۔ بعد ازاں 'بڑے' تو اپنے اپنے 'بڑے' کاموں میں مشغول و مصروف ہو گئے لیکن یہ 'چھوٹا' ؎

"ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنّم اب تک اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک!"

کے مصداق اپنے دل و دماغ کو اس جنّتِ گم گشتہ کے خیال سے فارغ نہ کر سکا، بلکہ جیسے جیسے دن بیتتے اس کا حال یہ ہوتا چلا گیا کہ ؎

تخم جس کا تُو ہماری کشتِ جاں میں بو گئی
شرکتِ غم سے یہ اُلفت اور محکم ہو گئی!

وہ جب جماعت سے علیٰحدہ ہوا اس کی عمر کُل پچیس برس تھی۔ بالکل نَوعمری کا عالم، نہ علم نہ تجربہ، لہٰذا پورے دس برس اس نے اس انتظار میں بسر کیے کہ 'بڑوں' میں سے کوئی ہمّت کرے اور از سرِ نَو سفر کا آغاز کر دے۔ لیکن اللہ کو یہ بھی منظور نہ ہوا تا آنکہ ۶۶-۱۹۶۷ء میں اُس نے خود کرمِ ہمّت کسی اور بفحوائے الفاظِ قرآنی "اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ"[1] درسِ قرآن کی صورت میں بیٹھے اسلامی دعوت کے لیے ذہنی و فکری سطح

---

[1] "یقیناً یہی قرآن ہے جو رہنمائی فرماتا ہے اس راہ کی طرف جو سب سے سیدھی اور سب سے درست ہے!" عجب حسنِ اتفاق ہے کہ یہ الفاظِ مبارکہ سورۃ بنی اسرائیل میں ان آیات کے فوراً بعد وارد ہوتے ہیں جو بنی اسرائیل اور اُمّتِ مسلمہ کی تاریخ میں مماثلت و مشابہت کے بیان میں اس تحریر میں تفصیل کے ساتھ زیرِ بحث آ چکی ہیں۔ مزید غور طلب نکتہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی تاریخ کا ذکر شروع ہوا تو رات کے ذکر سے "وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ" اور اس کا اختتام ہوا قرآن کے ذکر پر۔ گویا سابق اُمّت کی تاسیس بھی کتاب ہی کی بنیاد پر ہوئی تھی اور اس کے معزول کیے جانے کے بعد نئی اُمّتِ مسلمہ کی تاسیس بھی 'الکتاب' ہی کی بنیاد پر ہوئی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی 'تجدید' کے لیے بھی مبنیٰ و اساس قرآن کے سوا اور

پر میدان ہموار کرنے کا کام شروع کر دیا۔ اس کے کام کو اللہ تعالےٰ نے شرفِ قبول عطا فرمایا اور چند ہی سالوں میں اس کے قائم کردہ 'حلقہ ہائے مطالعۂ قرآن' کی کوکھ سے 'مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' برآمد ہوگئی اور اب اس کے بھی دو ہی سال بعد وہ اسی طیّبہ اصولی اسلامی تحریک کے احیاء کے لیے "تنظیمِ اسلامی" کے قیام کا ارادہ کر رہا ہے!

اسے خوب معلوم ہے کہ اس کے پاس نہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی سی عبقریت اور ذہانت و فطانت ہے، نہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی سی صلاحیتِ کار اور محنت و مشقت کا مادّہ۔ پھر نہ وہ شعلہ بیان خطیب ہے نہ صاحبِ طرز ادیب، بایں ہمہ ایک احساسِ فرض ہے جو چین نہیں لینے دیتا اور ایک عظیم تحریک کی امانت کے بار کا احساسِ گراں ہے جس نے اسے ؏

"ہرچہ بادا باد، ماکشتی در آب انداختیم"

کے مصداق اس پُرخطر وادی میں کُود پڑنے پر مجبور کر دیا ہے!

اب جو لوگ شخصیتوں اور جماعتوں کی سطح سے بلند تر ہو کر سوچنے اور غور و فکر کرنے کی ہمت اور صلاحیت ہی سے عاری ہوں اُن کا معاملہ تو دوسرا ہے، البتہ وہ لوگ جو کسی تحریک کے بنیادی نظریات و مقاصد پر نظر رکھتے ہوئے اپنے موقف پر نظرِ ثانی کی ہمت کر سکیں، ان کے لیے ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ انہیں چاہیے کہ ٹھنڈے دل کے ساتھ ہمارے موقف پر غور کریں۔ اور اگر انہیں اس میں صحت و صداقت نظر آئے تو ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہوں اور کمرِ ہمت کسیں!

بہر حال اپنی حد تک ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ؎

دریں دریائے بے پایاں، دریں طوفانِ موج افزا! سر افگندیم بسم اللہ مجرٖیہا و مرسٰہا!

(تسلسل) کوئی چیز نہیں بن سکتی ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن (اقبالؔ)

تنظیم اسلامی پاکستان کے زیر اہتمام منعقد ہونیوالے

دسمبر ۸۹ء اور جنوری ۹۰ء کے مجوزہ پروگرام

یہ پروگرام مرکزی دفتر تنظیم اسلامی پاکستان، گڑھی شاہو لاہور میں منعقد ہوں گے

یکم تا ۸ دسمبر ۱۹۸۹ء

تربیت گاہ برائے منتظم رفقاء

اس میں وہ تمام رفقاء شریک ہوں گے جنہوں نے مبتدی تربیتی نصاب مکمل کرلیا ہو

۲۲ دسمبر تا ۲۹ دسمبر ۸۹ء

خصوصی تربیت گاہ برائے طلبہ تنظیم اسلامی

اس میں طلبہ کے علاوہ دوسرے رفقاء تنظیم بھی شریک ہوسکیں گے۔
البتہ نوجوان رفقاء کو شرکت کی بھرپور کوشش کرنی چاہیے

۵ تا ۱۲ جنوری ۱۹۹۰ء

تربیت گاہ برائے مبتدی رفقاء

تنظیم اسلامی میں نئے شامل ہونے والے رفقاء کے علاوہ وہ پرانے رفقاء بھی اس میں شریک ہوں جنہوں نے ابھی تک مبتدی تربیتی نصاب شروع نہیں کیا۔

HOUSE OF QUALITY BEARINGS

KHALID TRADERS

IMPORTER, INDENTOR, STOCKIST, SUPPLIER,
OF ALL KINDS OF BALL, ROLLER & TAPER BEARINGS

WE HAVE : -BEARINGS FOR ALL INDUSTRIES & MARINE ENGINES.
- AUTOMOTIVE BEARINGS FOR CARS & TRUCKS.
- BEARINGS UNIT FOR ALL INDUSTRIAL USES.
- MINIATURE & MICRO BEARINGS FOR ELECTRICAL INSTRUMENTS.

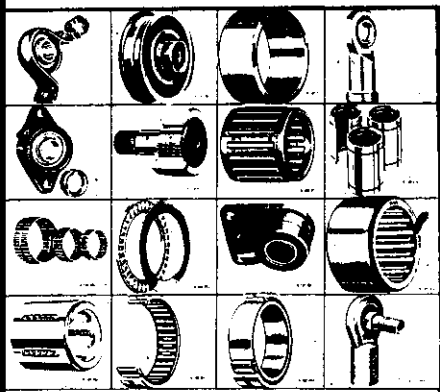

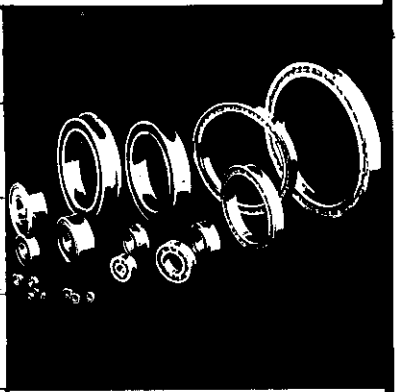

PRODUCTS

DISTRIBUTOR

RCD KBC EZO

EZO **HIGH PRECISION**

MINIATURE BEARINGS
EXTRA THIN TYPE BEARINGS
FLANGED BEARINGS
BORE DIA .1 mm TO 75 mm

STOCKIST

IKO TR NACHI Koyo NSK INA SKF NTN

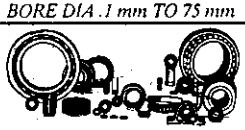

CONTACT : TEL. 732952 - 735883 - 730595
G.P.O BOX NO.1178.OPP KMC WORKSHOP
NISHTER ROAD, KARACHI - PAKISTAN
TELEX: 24824 TARIQPK. CABLE: DIMAND BALL.

تبلیغی جماعت کے ذمہ دار حضرات سے دردمندانہ گزارش

از قلم: سید تنظیم حسین

(قسط ۲)

رسالہ مسلمانوں کی موجودہ پستی کا واحد علاج

تبلیغی جماعت نے متذکرہ بالا پنچایت نامہ کے اعتبار سے اپنی سرگرمیاں شروع کر دیں اور اس کے لئے میوات کا علاقہ مناسب سمجھا گیا' کیونکہ شدھی کی تحریک کا تمام زور اسی علاقہ میں رہا تھا۔[۱] بہرحال برصغیر کے دیگر حصوں میں تبلیغ کے لئے جماعتیں نکلنے لگیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ تبلیغی جماعت کے پروگرام اور فی نفسہٖ تبلیغ سے متعلق کچھ شکوک و شبہات پیدا ہوئے جن میں سب سے اہم یہ تھا کہ تبلیغ دین کی بنیادی ذمہ داری علماء کرام کی ہے۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے حضرت مولانا محمد احتشام الحسنؒ صاحب نے ۱۳۵۸ھ/ ۱۹۳۹ء میں ایک رسالہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے ایماء پر تحریر فرمایا جس میں تبلیغی جماعت کے طرز تبلیغ اور اس کی ضرورت اور اہمیت کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس رسالے کا عنوان ہے: "مسلمانوں کی موجودہ پستی کا واحد علاج"۔ اس رسالہ کو دراصل پنچایت نامہ مرتّبہ ۱۹۳۴ء کا ضمیمہ سمجھنا چاہئے اور جو گفتگو بھی تبلیغی جماعت سے متعلق کی جائے اس میں اس رسالے کے مندرجات کو ذہن میں رکھنا لازمی ہوگا۔ اس رسالے میں جن امور کی وضاحت کی گئی ہے وہ یہ ہیں:

(۱) تبلیغِ دین کی ذمہ داری میں علماء کے ساتھ عامۃ المسلمین بھی شریک ہیں۔

(۲) نہی عن المنکر کی کوشش میں بھی علماء کے ساتھ عامۃ المسلمین بھی شریک ہیں۔

(۳) جہاد (بالسیف) کے لئے اس وقت موقع نہیں ہے اور یہ تحریک اس کا بدل ہے۔

گرد و پیش کے حالات (۱۹۳۴ء کے بعد)

۱۹۳۵ء میں برطانوی حکومت نے ہندوستان کے نظم و نسق سے متعلق ایک نیا قانون نافذ کیا کہ مسلمانوں کو ہندو کے عزائم کی ایک جھلک دیکھنے کو ملی۔ یہ جھلک دیکھتے ہی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور کاغذی شہسواروں کی جماعت کے تنِ مردہ میں ایسی جان آئی کہ وہ مہرِ نیمروز کی طرح نظارہ سوز ہو گئی۔ برسہا برس تک زنداں کی دیواروں سے سر پھوڑنے والے ایک طرف سمٹ کر رہ گئے۔ مطالبۂ پاکستان سامنے آیا اور اس شدّومد کے ساتھ کہ ہندو حیران رہ گئے اور خود تقسیمِ ملک کے امکانات کا جائزہ لینے لگے۔ مستقبل میں ہندوستان کی کیا شکل ہوگی، اہلِ بصیرت بھی سمجھنے سے عاری نظر آنے لگے۔ کچھ کہتے تھے کہ گو ماتا تقسیم نہیں ہو سکتی۔ کچھ کہتے تھے کہ 'نہیں' ہو کر رہے گی۔ جہاں تک حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کا تعلق ہے انہوں نے مسلم لیگ کے ایک جلسہ میں شرکت فرمائی اور ان کی تقریر کا ایک جملہ یہ بتلا رہا ہے کہ وہ مطالبۂ پاکستان کے مخالف نہ تھے۔ جملہ یہ ہے:

"مولانا (حسین احمد مدنیؒ) کی سیاسی رائے میری سمجھ سے بالا ہے۔ اگر میں ان سے اتفاق کرتا تو ان کی کفش برداری کرتا....."

(ماہنامہ "الرشید"، ساہیوال، مدنی و اقبال نمبر ص ۳۳۲)

حضرت مولانا محمد الیاس صاحب اور مولانا ابو الاعلیٰ مودودی

مولانا مودودی اس زمانہ میں مسلمانوں کے ایک ابھرتے ہوئے لیڈر سمجھے جاتے تھے۔ ان کی دیگر کتابوں کے علاوہ ان کی کتاب "الجہاد فی الاسلام" کے متعلق قریب قریب ہر حلقہ سے تحسین و آفرین کے کلمات سنے جاتے تھے۔ ۱۹۳۹ء میں ٹاؤن ہال لاہور میں ان کی جہاد سے متعلق تقریر مسلمانوں کے دل و دماغ کو حیاتِ تازہ بخش رہی تھی[۱۵] کہ اچانک علامہ مشرقی کو مشرکی قرار دے دیا گیا حالانکہ ان کے پروگرام سے سب متفق تھے[۱۶] اور اس طرح

خاکسار تحریک کی جوان موت پر ہندوؤں کے یہاں گھی کے چراغ جلائے گئے خیال ہے کہ حضرت مولانا الیاس صاحب بھی مولانا مودودی کے افکار سے متاثر تھے کیونکہ وہ ان کے رسالے ترجمان القرآن کے مستقل خریدار تھے۔ ادھر مولانا مودودی بھی مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی تحریک و دعوت پر ایک مؤثر مضمون لکھ چکے تھے[۱] ان دونوں بزرگوں میں ملاقات بھی ہوتی رہتی تھی لیکن آخری بار ملاقات طے ہو جانے کے بعد مولانا مودودی تشریف نہیں لائے اور یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ مولانا مودودی سے ملاقاتیں اور ترجمان القرآن کا مطالعہ یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ حضرت مولانا کسی بھی دوسری تحریک سے تعاون کے لئے تیار تھے۔ اس کے اشارات صفحہ ء گزشتہ پر اقتباسات سے بھی ملتے ہیں اور ان (مولانا مودودی) کے رفیق خاص جناب محمد ابن علی علوی صاحب کی ایک قلمی یادداشت سے بھی[۲] یہ حضرت مولانا الیاس صاحب نور اللہ مرقدہ کی بالغ نظری کا بین ثبوت ہے۔

تبلیغی جماعت اور نظریہ ء جہاد

اگرچہ اس تحریک کے پروگرام اور طریق کار کی نوعیت ابتدائی تھی۔ لیکن مولانا محمد احتشام الحسن صاحبؒ کے تحریر کردہ رسالے "مسلمانوں کی موجودہ پستی کا واحد علاج" جس کا گزشتہ صفحات میں ذکر آچکا ہے، "جہاد" سے متعلق یہ تحریر ملتی ہے۔

"اگرچہ آیت[۳] میں جہاد سے مراد کفار کے مقابلہ میں سینہ سپر ہونا ہے تاکہ اسلام کا بول بالا ہو اور کفر و شرک مغلوب و مقہور ہو لیکن بدقسمتی سے آج ہم اس سعادت عظمیٰ سے محروم ہیں تو اس مقصد کے لئے جس قدر جدوجہد ہماری مقدرت و استطاعت میں ہے، اس میں تو ہرگز کوتاہی نہ کرنی چاہئے۔ پھر ہماری یہی معمولی حرکتِ عمل اور جدوجہد ہمیں کشاں کشاں آگے بڑھائے گی"۔

اس عبارت کے ساتھ ساتھ ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"حق تعالیٰ نے ہم سے دو چیزوں کا مطالبہ کیا۔ اول یہ کہ ہم خدا اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاویں، دوسرے یہ کہ اپنے جان و مال سے خدا کی راہ میں جہاد کریں اور اس کے بدلے میں دو چیزوں کی ہم سے ضمانت لی۔ آخرت میں جنت اور ابدی چین اور راحت اور دنیا میں نصرت و کامیابی۔ پہلی چیز جو ہم سے مطلوب ہے وہ ایمان ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے اس طریق کا منشا بھی یہی ہے کہ ہمیں حقیقی

ایمان کی دولت نصیب ہو' دوسری چیز جو ہم سے مطلوب ہے' وہ جہاد ہے۔ جہاد کی اصل اگرچہ کفار کے ساتھ جنگ اور مقابلہ ہے مگر درحقیقت جہاد کا منشا بھی اعلاء کلمۃ اللہ اور احکام خداوندی کا نفاذ اور اجراء ہے اور یہی ہماری تحریک کا مقصدِ اصلی ہے"۔

ان دونوں عبارتوں سے ظاہر ہے کہ مولانا محمد احتشام الحسن صاحبؒ کے پیش نظر ہندوستان میں مسلمانوں کی خصوصی کیفیت' دیگر حالات اور تقاضائے وقت رہا ہوگا یعنی یہ کہ برصغیر میں مسلمان اقلیت میں ہیں اور یہ سلطانیٔ جمہور کا زمانہ ہے (اس وقت کوئی یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ ہندوستان کے مغربی و مشرقی علاقوں میں ایک خود مختار اسلامی ریاست قائم ہو جائے گی)۔ اس لئے انہوں نے اپنی تحریک کی جدوجہد کو خدا کی راہ میں "جان سے جہاد" کا بدل بتلایا ورنہ یہ تو ہر کہ ومہ جانتا ہے کہ: ع

شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے!

مولانا محمد الیاس صاحبؒ اور سید احمد شہیدؒ

یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفیق حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ سے متعلق ایک طویل عرصہ تک مخالفانہ بلکہ معاندانہ فضا قائم رہی (کچھ حلقوں میں اب تک موجود ہے) ان کو "وہابی" قرار دے کر ہر کہ ومہ کے منہ میں جو آیا اس نے کہا' جس نے جو چاہا لکھا' حالانکہ یہ سب کو معلوم تھا کہ اس پروپیگنڈے کے پردۂ زنگاری میں انگریز بہادر چھپا ہوا ہے۔ اللہ پاک جزائے خیر دے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں مدظلہ العالی کو کہ انہوں نے ۱۹۳۹ء میں سیرت سید احمد شہیدؒ لکھ کر اس عاشقِ حریت کی حقیقت سے ملت کو آشنا کیا۔

پھر کیا تھا ہر طرف سے آواز آنے لگی کہ یہ "مجاہد اعظم" تو ہمارا ہے۔ اب وقت تبدیل ہو رہا تھا۔ انگریز بہادر جس کے خوف سے زبانیں گنگ ہو گئی تھیں' خود ہندوستان سے رختِ سفر باندھ رہا تھا۔ مولانا علی میاں کی کتاب کی خوب پذیرائی ہوئی[۱] لیکن حضرت سید صاحبؒ کو وہابی تحریک کا بانی قرار دے کر انگریزی حکومت کی سرپرستی میں کئے جانے والے پروپیگنڈے کے اثرات باقی رہے اور کچھ بزرگ اس تحریکِ جہاد کو خطائے اجتہادی تو کہتے ہی رہے۔ جہاں تک حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کا تعلق ہے تو ماہنامہ "الفرقان" بابت ماہ

محرم الحرام ۱۳۶۴ھ میں شائع شدہ حضرت مولانا کے ملفوظات (مرتبہ مولانا ظفر احمد تھانویؒ) سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ حضرت مولاناؒ نے حضرت سید احمد شہیدؒ کی جہاد سے متعلق سعی و عمل کی بند الفاظ میں تائید کی۔ یہ ملفوظ اس طرح ہے:

"(۶) ایک بار فرمایا: مولانا! ہماری تبلیغ میں علم اور ذکر کی بڑی اہمیت ہے۔ بدون علم کے نہ عمل ہو نہ عمل کی معرفت اور بدون ذکر کے علم ظلمت ہی ظلمت ہے' اس میں نور نہیں ہو سکتا۔ مگر ہمارے کام کرنے والوں میں اس کی کمی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ تبلیغ خود بہت اہم فریضہ ہے۔ اس کی وجہ سے ذکر میں کمی ہونا ویسا ہی ہے جیسا حضرت سید صاحب بریلوی قدس سرہ نے جس وقت جہاد کی تیاری کے لئے اپنے خدام کو بجائے ذکر و شغل کے نشانہ بازی اور گھوڑے کی سواری میں مشغول کر دیا تو بعض نے یہ شکایت کی کہ اس وقت پہلے جیسے انوار نہیں ہیں' تو حضرت سید صاحب نے فرمایا کہ ہاں اس وقت ذکر کے انوار نہیں ہیں اور جہاد کے انوار ہیں اور اس وقت اسی کی ضرورت ہے۔ فرمایا اگرچہ مجھے علم اور ذکر کی کمی کا قلق ہے' اور یہ کمی اس واسطے ہے کہ اب تک اہل علم اور اہل ذکر اس میں نہیں لگے ہیں۔ اگر یہ حضرات آکر اپنے ہاتھ میں کام لے لیں تو یہ کمی بھی پوری ہو جائے۔ مگر علماء اور اہل ذکر تو ابھی تک اس میں بہت کم آئے ہیں"۔

اس سلسلے میں مولانا سید ابوالحسن علی میاں مدظلہ کی سوانح حیات "کاروان زندگی" سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

"مولانا نے غالباً اسی قیام کے زمانہ میں فرمایا کہ مولانا میں نے آپ کی کتاب (سیرت سید احمد شہیدؒ) پڑھی لیکن اس سے میری معلومات میں کچھ اضافہ نہیں ہوا۔ میں اپنے خاندان کی بیبیوں اور بزرگوں سے اس سے زیادہ ہی سن چکا ہوں' بات سے بات یاد آتی ہے' ایک مرتبہ میں مسجد کے بالائی حصہ میں ٹھہرا ہوا تھا' جہاں صاحبزادہ عگرامی مولانا محمد یوسف صاحب کا قیام رہتا تھا' مولانا چائے کی ایک پیالی ہاتھ میں لے کر تشریف لائے' میری طرف پیالی بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ مولانا ابھی تک ہم لوگ حضرت سید صاحب کی تجدید کے سایہ ہی میں ہیں"۔

("کاروان زندگی"' حصہ اول' صفحہ ۲۸۱)

اگرچہ ان دونوں اقتباسات سے حضرت سید احمد شہیدؒ سے متعلق حضرت مولانا محمد

الیاس صاحبؒ کی دو ٹوک رائے واضح نہیں ہوتی لیکن یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی حضرت سید صاحبؒ کی تحریک جہاد سے متعلق معلومات اس سے زیادہ تھیں جن کا ذکر مولانا علی میاں مدظلہ نے سیرت سید احمد شہیدؒ میں کیا ہے، لیکن حضرت مولاناؒ کے آخری جملہ میں تحریک جہاد کی عظمت و اہمیت کے اعتراف کے ساتھ احسان مندی کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ بہرحال یہ وہ وقت تھا جب ہندوستان میں ایک طرف تو قادیانی جماعت حکومت کی سرپرستی میں کھلم کھلا جہاد سے متعلق منفی سوچ پیش کر رہی تھی، دوسری طرف ایک بڑا روشن خیال طبقہ بھی تھا جو مغربی دنیا کے اسلامی نظریہء جہاد پر حملوں کی تاب نہ لاکر اسلام کو "امن و سلامتی" کا دین کہنے لگا تھا اور جہاد کی ضرورت کا منکر اور اس کو اس دور میں غیر ضروری کہنے لگا تھا۔ اس طبقہ میں کچھ علماء بھی شامل تھے جیسا کہ اقبال نے کہا:

فتویٰ یہ شیخ کا ہے زمانہ قلم کا ہے
اس دور میں نہیں رہی تلوار کارگر

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کا وصال

۳ر جولائی ۱۹۴۴ء کو حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ اللہ کو اس طرح پیارے ہوئے گویا خود خلاقِ عالم کہہ رہا تھا:

"اے اطمینان والی روح! تو اپنے پروردگار کی طرف چل اس طرح کہ تو اُس سے خوش وہ تجھ سے خوش ـــــ پھر تو میرے بندوں میں شامل ہوجا اور میری جنت میں داخل ہوجا"۔ (الفجر: ۲۶، ۲۷)

مولاناؒ نے اپنی جدوجہد کے ثمرات خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لئے۔ بستی نظام الدینؒ (دہلی) میں بنگلہ والی مسجد مرجع خواص وانام بن گئی۔ عارف وعامی سب مولاناؒ کے گوشہء چشم کے منتظر رہے۔ مولاناؒ کی نگاہوں میں ایک جادو تھا جس پر نظر پڑتی انہی کا ہو رہتا۔ مصیبتیں اٹھانا، تکالیف برداشت کرنا، مگر آستانِ یار سے اٹھنا گوارا نہ کرنا۔ اس کے ساتھ ساتھ حضرت مولاناؒ نے تبلیغی جماعت کو ایک مستحکم فعّال ادارے کی حیثیت میں چھوڑا اور اپنی حیات طیبہ میں تقلید جامد کے عوارضات کے پیشِ نظر یہ اچھی طرح واضح کر دیا:

(۱) تبلیغی جماعت کا پروگرام ابتدائی نوعیت کا ہے اور اس کا مقصد ہندی مسلمانوں میں احیاءِ دین ہے۔

(۲) امر بالمعروف کے ساتھ نہی عن المنکر لازم ہے۔

(۳) جان سے جہاد کا سرِ دست موقع نہیں ہے۔
(۴) مقاصدِ بالا کے حصول کے لئے علماء و صلحاء سے تعاون کیا جائے گا۔
(۵) تحریک کا اصل مقصد اسلام کے پورے علمی و عملی نظام سے امّت کو وابستہ کرنا ہے۔

تبلیغی نصاب

تبلیغی جماعت سے منسلک حضرات کے مطالعہ کے لئے جن کتابوں کو ضروری سمجھا گیا ان کا ذکر صفحات گزشتہ میں کیا گیا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد (یہ نہیں کہا جا سکتا کس مرحلہ پر) مندرجہ ذیل کتابوں کا ایک مجموعہ "تبلیغی نصاب" کے عنوان سے سامنے آیا۔ یہ مجموعہ بہت مقبول ہوا۔

(۱) حکایات صحابہ (۲) فضائل تبلیغ (۳) فضائل ذکر (۴) فضائل نماز (۵) فضائل قرآن (۶) فضائل رمضان (۷) فضائل درود شریف (۸) مسلمانوں کی موجودہ پستی کا واحد علاج

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے وصال کے بعد

حضرت مولاناؒ کے وصال (۱۹۴۴ء) کے بعد تبلیغی جماعت کی باگ ڈور ان کے خلف الرشید مولانا محمد یوسفؒ کے سپرد ہوئی اور جماعت ۱۹۴۷ء تک اسی ڈگر پر چلتی رہی جس پر اسے حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ چھوڑ گئے تھے۔

الحاصل

تبلیغی جماعت اس پروگرام پر جو غلام ہندوستان اور مسلمانانِ ہند کے اُس وقت کے خصوصی حالات کے تحت وضع کیا گیا تھا اور جو نہ صرف قطعی ابتدائی نوعیت کا تھا بلکہ بنیادی طور پر جس کی افادیت ہندوستانی مسلمانوں تک محدود تھی، مقبولیت کے باوجود تیرہ سال تک عمل کرتی رہی۔ غالباً اس لئے کہ ملک میں شدید انتشار تھا اور سیاسی حالات غیر یقینی تھے یعنی مستقبل واضح نہ تھا۔

۱۴۔ دیکھئے تبلیغی جماعت کا تاریخی جائزہ 'از ڈاکٹر ایوب قادری'
۱۵۔ اس کا عربی ترجمہ سعودیہ عربیہ کے شعبہء "دار الافتاء والدعوۃ والارشاد" کی جانب سے شائع ہو رہا ہے۔
۱۶۔ ملاحظہ کیجئے "سرسکندر اور خاکسار تحریک" مرتبہ محمد علی فاروق 'مکتبہ حریت' لاہور

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا

اے ہمارے رَبّ، اگر ہم بھول جائیں یا چُوک جائیں تو (ان گناہوں پر) ہماری گرفت نہ فرما۔

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ

اور اے ہمارے رَبّ، ہم پر ویسا بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے اُن لوگوں پر ڈالا

عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا

جو ہم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ

اور اے ہمارے رَبّ، ایسا بوجھ ہم سے نہ اٹھوا جس کے اُٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے۔

وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا

اور ہماری خطاؤں سے درگذر فرما، اور ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما۔

اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝

تو ہی ہمارا کارساز ہے۔ پس کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔

ہمیں توبہ کی توفیق عطا کر دے

ہماری خطاؤں کو اپنی رحمتوں سے ڈھانپ لے

الداعی الی الخیر: میاں عبدالواحد
بھگوان سٹریٹ
پرانی انارکلی لاہور

سیف گیمز میں خواتین کی شرکت کے خلاف

تنظیم اسلامی لاہور اور راولپنڈی/اسلام آباد کے زیر اہتمام

پُرامن احتجاجی مظاہرے

(ا) لاہور

ملک خداداد پاکستان، برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ وعدہ کر کے حاصل کیا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں ایک آزاد اور خود مختار خطہ ارضی عطا فرمادے تو ہم اس میں دین اسلام کا نفاذ کر دیں گے۔ اور قائد اعظم کے الفاظ میں "ہم ایک آزاد خطہ ارضی اس لئے حاصل کرنا چاہتے ہیں تاکہ ہم دنیا کے سامنے اسلام کے اصولِ اخوت و حریت و مساوات کا ایک نمونہ پیش کر سکیں"۔ لیکن افسوس کہ پاکستان کی گذشتہ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ پاکستان کے باشندے اپنے اس ہدف و مقصد سے مسلسل دور ہی ہوتے چلے گئے اور یہاں ایک سے بڑھ کر ایک منکر رواج پاتا اور مستحکم ہوتا چلا گیا اور ہر نیا منکر دوسرے مزید منکرات کے لئے دروازے وا کرتا گیا...... اس میں قصور کس کس کا اور کتنا ہے یہ اس وقت ہمارا موضوع نہیں ہے۔ مختصراً یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ بحیثیت مجموعی اس جرم میں کم و بیش قوم کا ہر ہر فرد شریک ہے۔ الا ماشاء اللہ۔

آج معاشرے کی حالت یہ ہو چکی ہے "کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی" کے مصداق معاشرے کی اقدار اور Value structure بالکل بدل کر رہ گئے ہیں۔ اور منکرات ہیں کہ بڑھتے ہی چلے جا رہے ہیں...... دوسرے بہت سے منکرات کے علاوہ سود اور جوئے کی بہت سی قسمیں تو پہلے ہی ... تھیں، سیور ... بفل کا مزید اضافہ ہو گیا جس میں ساری قوم کو پوری آن بان شان کے ساتھ مبتلا کیا گیا۔ اسی طرح مغرب زدہ بلکہ مغرب پرست خواتین کی بے پردگی و بے حجابی ہی نہیں بلکہ بے حیائی و حیاباختگی پہلے ہی اپنی جولانیاں دکھا رہی تھی اس پر مزید اضافہ یہ ہوا کہ سیف گیمز کے موقعہ پر فیصلہ کیا گیا کہ خواتین ... ہزاروں مرد تماشائیوں کی موجودگی میں اپنی جسمانی چستی (Physical Fitness) کا مظاہرہ کریں گی اور کھیلوں میں حصہ لیں گی پھر مزید یہ کہ اس کو ٹیلی وژن کے ذریعہ وطن عزیز کے کروڑوں باشندے دیکھیں گے جن میں مرد تو شامل ہوں گے ہی وہ معصوم بچیاں بھی شامل ہوں گی جن کی گود میں اگلی نسل نے پروان چڑھنا ہے۔ یوں معاشرے میں موجود رہی سہی اقدار کو بھی مسمار کرنے

کی مہم تیز کر دی گئی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس نئے منکر کی بنیاد پر کون سے نئے منکرات سر ابھارتے ہیں۔ اور کچھ بعید نہیں کہ کل کلاں کو ہماری بہو بیٹیاں اور بہنیں ہمیں طعنہ دیں کہ تم لوگ نہ جانے کیسے دقیانوسی خیالات کے حامل ہو کہ ہمیں پردے میں بٹھانا چاہتے ہو حالانکہ سارا معاشرہ تو مساوات مرد و زن کا قائل ہے حتیٰ کہ عورتوں کو کھیلوں تک میں حصہ لینے کی کھلی اجازت ہے۔

ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے تنظیم اسلامی نے اس منکر کو ہدفِ تنقید بنا کر ایک پرامن مظاہرہ کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ ارباب اختیار تک اپنے جذبات پہنچائے جاسکیں۔ اور باشعور شہریوں کو اس منکر کی طرف متوجہ کیا جاسکے۔

یہ مظاہرہ بھی مظاہروں کے اس سلسلے کی کڑی تھا جو کہ تنظیم اسلامی نے قومی روز ناموں میں بے حیائی و فحاشی و عریانی کے خلاف روز نامہ جنگ اور نوائے وقت کے لاہور' کراچی اور راولپنڈی کے دفاتر کے سامنے مظاہروں سے شروع کیا تھا' پاکستان ٹیلی وژن کے دفاتر کے سامنے بھی اسی سلسلے میں مظاہرے کئے تھے۔ اور اس سلسلے کا آخری مظاہرہ سیور ریفل ٹکٹ کے خلاف ریگل چوک لاہور میں کیا گیا تھا۔

حالیہ مظاہرے کے لئے بدھ ۱۸ اکتوبر کا دن مقرر کیا گیا تھا۔ مقررہ وقت سے پہلے رفقاء تنظیم مسجد شہداء پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔ رفقاء تنظیم کے چہرے دینی غیرت و حمیت کے باعث تمتما رہے تھے اور ان کے دلوں میں جذبات موجزن تھے کہ وہ قوت و طاقت کے استعمال سے اس منکر کا قلع قمع کر دیں اور ساتھ ہی دوسرے منکرات کے خلاف بھی جہاد بالید کا آغاز کر دیں لیکن انقلابی عمل (Revolutionary Process) کی حکمت و ترتیب (جو کہ ہم نے منہج انقلاب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ کی ہے۔) کا یہ تقاضا تھا کہ ابھی احتجاج صرف زبان کی حد تک رہنا چاہئے کیونکہ تنظیمی و تربیتی لحاظ سے وہ مرحلہ ابھی نہیں آیا کہ منکرات اور برائیوں کو ہاتھ سے روکنے کا آغاز کر دیا جائے۔ اس طرح وقتی اور جذباتی ہنگامہ آرائی' نتائج کے لحاظ سے الٹا نقصان دہ ہوا کرتی ہے۔ جس سے گریز ضروری ہے۔ اس طرح گویا رفقاء کرام نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث مبارک کے دوسرے مرحلے یا درجے پر عمل کیا جس میں منکرات کے خلاف جدوجہد کے تین مراحل یا درجے بیان فرمائے گئے ہیں۔ یعنی

عن ابی سعید الخدری رضی قال : سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول من رأی منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ وذلک اضعف الایمان ۔ (رواہ مسلم)

(ترجمہ) حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو کوئی بھی تم میں سے کسی برائی کو دیکھے تو اسے چاہئے کہ اسے اپنے ہاتھ سے روک دے۔ پھر اگر اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اس کو اپنی زبان سے (روکے) پھر اگر

اس کی (بھی) استطاعت نہ رکھتا ہو تو پھر اس کو اپنے دل سے روکے (یعنی دل سے برا جانے) اور یہ بات (کہ دل سے برا جاننا) کمزور ترین ایمان ہے (اس حدیث مبارک کو امام مسلم نے روایت کیا)

بہر حال وقت مقررہ سے پہلے رفقاء مسجد شہداء پہنچے۔ نماز عصر کے بعد ایک بزرگ رفیق محترم الطاف حسین صاحب نے پہلی صف سے کھڑے ہو کر مظاہرے کا اعلان کیا اور دیگر احباب کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دی۔ بعد میں رفقاء مسجد سے باہر صحن میں جمع ہوئے اور مظاہرے کے پروگرام کے امیر محترم ڈاکٹر عبدالخالق صاحب نے اپنے ٹھہرے ہوئے دھیمے اور مشفقانہ انداز میں رفقاء کرام کو مظاہرے کے متعلق ہدایات دیں جو اب تمام رفقاء کو حفظ ہو چکی تھیں کہ وہ اپنی نیت کو خالص رکھیں کہ ہم یہ سب کچھ رضائے الٰہی کے حصول اور نجات اخروی کے لئے کر رہے ہیں۔ وہ مظاہرے کے دوران آپس میں گفتگو نہیں کریں گے۔ اپنی نگاہوں کی حفاظت کریں گے۔ لسان و قلب کو ذکر اللہ سے تر و مشغول رکھیں گے۔ کسی قسم کی نعرہ بازی نہیں کریں گے۔ کسی قسم کی اشتعال انگیزی اور آوازہ کسے جانے پر غصہ کو ضبط کرتے ہوئے صبر و تحمل کا مظاہرہ کریں گے۔ اور اگر کوئی راہ گیر کوئی بات پوچھے گا تو خود جواب دینے کی بجائے اسے امیر کی طرف Refer کریں گے۔

اس کے بعد رفقاء کو Placards اور بینرز دیئے گئے۔ بزرگ رفقاء کو Placards اٹھانے کی زحمت نہ دی گئی یوں رفقاء فوجی انداز میں نظم و ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک لائن کی صورت میں باوقار اور سنجیدہ انداز میں اپنے اپنے ہدف کی طرف بڑھے۔ ریگل چوک پر مال روڈ (شاہراہ قائد اعظم) کے دونوں طرف فٹ پاتھ پر اپنی فارمیشن بنانے کے لئے رفقاء نے سرخ اشارہ ہونے پر ٹریفک رک جانے کے بعد سڑک کو زیبرا کراسنگ سے عبور کیا اور اپنی مقرر کردہ جگہوں پر پہنچ گئے۔

رفقاء پلے کارڈ اور بینرز اس طرح اٹھائے ہوئے تھے کہ وہ آنے والی ٹریفک سے ۴۰° ۴۵° درجے کا زاویہ بناتے تھے اس طرح دور ہی سے ان کو پڑھنا آسان ہو جاتا تھا۔ اس مظاہرے میں چار پانچ پلے کارڈ پر ایک ہی طرح کی عبارت لکھی گئی تھی یہ طریقہ بھی پڑھنے والوں کو بہت آسانی مہیا کر رہا تھا یوں وہ ہمارے پیغام سے زیادہ بہتر انداز میں آگاہ ہو رہے تھے۔ Placards اور بینرز پر جو عبارات لکھی گئی تھیں وہ مندرجہ ذیل تھیں۔

۔ خدارا مستورات کو مستورات ہی رہنے دو سیف گیمز میں شامل کر کے شمع محفل نہ بناؤ۔

۔ کسی بانیت مسلمان کو سیف گیمز میں خواتین کھلاڑیوں کی شرکت گوارا نہیں ہو سکتی۔

۔ مخلوط تعلیم کے بعد مخلوط کھیل عذاب الٰہی کا پیش خیمہ ہیں۔

۔ فحاشی و عریانی کا ظہور جس شکل میں بھی ہو قابل مذمت ہے۔

۔ نامحرم مردوں کے سامنے خواتین کا بے حجابانہ کھیلوں میں حصہ لینا احکام دین کی صریح خلاف ورزی ہے

۔ اسلام کے نام پر حاصل کئے گئے ملک میں خواتین کی سیف گیمز میں شرکت باعث شرم ہے۔

۔ کیا خواتین کی کھیلیں مردوں کی موجودگی کے بغیر ممکن نہیں ہیں؟۔
۔ خواتین ضرور کھیلیں مگر خواتین تماشائیوں کی موجودگی میں۔

مظاہرے کے دوران آٹھ' دس رفقاء کرام راہ گیروں اور ہر قسم کی سواری میں موجود افراد کو ایک ورقہ بھی تقسیم کرتے رہے جو کہ خاص اسی موقع کے لئے چھپوایا گیا تھا۔ وہ ایک ورقہ آپ اس رپورٹ کے آخر میں ملاحظ کر سکتے ہیں۔

آخری لمحات میں رفقاء نے اسی نظم و ضبط کے ساتھ قطار بنائے ہوئے پلے کارڈ اور بینرز کے ساتھ ریگل چوک (مسجد شہداء) سے واپڈا ہاؤس چوک (چیرنگ کراس) تک مارچ کیا اور پھر اسی طرح واپس مسجد شہداء تک آ گئے۔ یوں یہ انتہائی مہذب و منظم مظاہرہ اپنے اختتام کو پہنچا۔ اب اذان مغرب کا وقت ہو چلا تھا لہٰذا اجتماعی دعا کا وقت نہ تھا جو کہ مظاہرہ کے اختتام پر مانگی جاتی ہے۔ رفقاء فوری طور پر نمازِ مغرب کی تیاریوں میں مشغول ہو گئے۔ نماز مغرب کے بعد ساتھیوں نے انفرادی طور پر اللہ تعالیٰ سے دعائیں کیں پہلے اپنی کمی و کوتاہی کا برملا اعتراف کیا اور اللہ سے اسے درگزر کرنے کی دعا کی پھر مزید بہتری کی استدعا کی۔ ساتھ ہی اس کوشش کو قبول فرمانے کی دعا بھی کی۔ اور یہ دعا بھی کی کہ مسلمانانِ پاکستان بیدار ہو کر اپنی دینی ذمہ داریوں کو سر انجام دینے کی سعی کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ آمین۔

(مرتب: محمد راشد)

دورانِ مظاہرہ تقسیم کئے جانے والے ہینڈ بل کا عکس

سیف گیمز میں خواتین کی شرکت ـــــ لمحۂ فکریہ

"کہ غیرت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے"

چوتھی سیف گیمز کا آغاز اگلے چند روز میں ہوا چاہتا ہے۔ ملک و ملت کا درد رکھنے والے اور دین و مذہب سے کسی بھی درجے میں لگاؤ رکھنے والے پاکستان کے ہر شہری کو یہ خبر بے چین کیے دے رہی ہے کہ ان کھیلوں میں پاکستانی خواتین بھی مردوں کے شانہ بشانہ، شرکت کریں گی۔

ہر باشعور مسلمان اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ ہمارا دین عورتوں کے لیے ستر و حجاب کی پابندی کو لازم قرار دیتا ہے۔ اور مردوں کے مخلوط اجتماعات خواہ وہ دینی و مذہبی مقاصد کے لیے ہی منعقد کیے گئے ہوں، اسلام کے مزاج سے قطعاً مناسبت نہیں رکھتے۔ چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان ایسے ملک میں جو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا، نامحرم مردوں کی نگاہوں کے سامنے چست و مختصر لباس میں ملبوس مسلمان خواتین کا کھیلوں میں حصہ لینا قابلِ افسوس ہی نہیں باعثِ شرم و ندامت ہے۔ دینی حمیت و غیرت رکھنے والا کوئی شخص یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اُس کی بہنیں اور بیٹیاں یوں بے حجابانہ اور بے باکانہ انداز میں غیر مردوں کے سامنے آئیں کہ ہزاروں نہیں لاکھوں نگاہیں اُن پر مرکوز ہوں۔ (ظاہر بات ہے کہ ٹیلی ویژن پر ان کھیلوں کے منظر جب دکھائے جائیں گے تو ناظرین کا دائرہ بہت وسیع ہو جائے گا)

واضح رہے کہ خواتین اگر گرلز کالجوں اور سکولوں کی حد تک اندر جہاں تماشائیوں کی صفیں بھی صرف خواتین ہی پر مشتمل ہوں، کھیلوں میں حصہ لیں تو دینی نقطۂ نگاہ سے ہرگز کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ خواتین کا حق ہے کہ انہیں بھی اپنے جسم و ذہن کو تندرست رکھنے کے لیے 'ان ڈور' اور 'آؤٹ ڈور' کھیلوں کے مواقع ملنے چاہییں لیکن اُن کی تمام بھاگ دوڑ اور کھیل کود زنانہ سکولوں اور کالجوں کی چار دیواری کے اندر اندر ہونی چاہیئے غیر مردوں کے سامنے نہیں!

یہاں ہم اس حقیقت کے اعادے کو ضروری خیال کرتے ہیں کہ پاکستان اسلام ہی کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اور اس کی بقاء و استحکام بھی اسلام ہی کے ساتھ وابستہ ہے۔ چنانچہ یہ جان لینا چاہیے کہ یہاں غیر اسلامی روایات کو فروغ دینے کی ہر کوشش اور اقدارِ دینی کا جنازہ نکالنے کی ہر کاوش اِس ملک کی جڑیں کھودنے کے مترادف ہوگی ـــــ اس ملک کے اربابِ حل و عقد کو یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اس ملک کے عوام کا دینی شعور اگرچہ بہت بیدار نہیں ہے لیکن ابھی بالکل مردہ بھی نہیں ہوا ہے اور غیرت و حمیت دینی کے جذبات میں اگرچہ ابال نہیں ہے لیکن یہ جذبات ابھی پورے طور پر سرد نہیں پڑے ہیں۔ گویا معاملہ وہی ہے کہ "آگ بجھی ہوئی نہ جان' آگ دبی ہوئی سمجھ" اور اس نوع کا کوئی بھی غیر اسلامی اقدام اِس دبی ہوئی چنگاری کو بھڑکتی آگ میں تبدیل کر سکتا ہے جو ان کے خرمنِ اقتدار کو جلا کر بھسم کر کے رکھ دے گی۔

اُن لوگوں سے جن کے ہاتھوں میں اس ملک کی زمام کار ہے، ہماری گزارش ہے کہ خدارا اس معاملے پر نظرِ ثانی کرتے ہوئے سیف گیمز میں خواتین کی شرکت کے فیصلے کو واپس لیا جائے اور احکامِ دینی کی صریح خلاف ورزی سے اجتناب کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ افراد کے گناہوں سے اللہ تعالیٰ اس دنیا میں درگزر فرما لیتے ہیں لیکن قوموں کے اجتماعی گناہوں پر گرفت بہت جلد ہو جایا کرتی ہے۔ ؎

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے ۔۔۔ نہیں کرتی کبھی ملت کے گناہوں کو معاف

---

(۲) راولپنڈی / اسلام آباد

ملکِ خداداد پاکستان میں دیگر منکرات کے ساتھ ساتھ عریانی اور فحاشی جس تیزی سے پھیل رہی ہے اس نے ہر صاحبِ ایمان کو خاصا فکر مند کر دیا ہے۔ فلم، ٹی وی اور روزنامہ اخبارات کا کردار کسی بیان کا محتاج نہیں۔ آج حالت یہ ہے کہ باحیا خواتین پردے میں رہنے کے باعث قدامت پسند اور نہ جانے کیسے کیسے ناموں سے پکاری جاتی ہیں۔ نت نئے فیشن اور اُن میں مرد و زن کی یکساں دلچسپی نے معاشرے کو پیچ در پیچ اخلاقی برائیوں اور مالی بدعنوانیوں میں بری طرح سے ملوث کر دیا ہے۔

فلم اور ٹی وی کو زندگی کی Second reality یعنی دوسری حقیقت کہا جاتا ہے اور اس کے ذریعے پھیلنے والی فکر اور سوچ جس تیزی سے اور جس مؤثر انداز میں First reality یعنی حقیقی زندگی پر اپنی گرفت کرتی ہے وہ کوئی تفصیل طلب بات نہیں۔ ویسے تو برائیاں ہمارے معاشرے میں مسلسل نفوذ کر رہی ہیں لیکن اب ان کا بھرپور اور وسیع پیمانے پر ظہور خواتین کی کھیلوں میں شرکت سے ہوا ہے۔

اسلام کے نام پر بننے والے ملک کے وفاقی دارالحکومت میں پاکستان کے بانی کے نام سے منسوب 'جناح سٹیڈیم' میں مسلمان ماں باپ کی مسلمان بیٹیاں مسلم اور غیر مسلم مردوں کے شانہ بشانہ اچھل کود

اور بھاگ دوڑ کا مظاہرہ کر رہی ہیں' جنہیں سٹیڈیم میں موجود ہزاروں نامحرم مردوں کے علاوہ ٹیلی وژن پر کروڑوں نامحرم افراد بھی دیکھ رہے ہیں ۔ اور پاکستانی مسلمان قوم تالیاں بجا رہی اور خوش ہو رہی ہے کہ ہم بھی ترقی یافتہ ہو گئے ہیں ۔ بقول جناب رحمان کیانی ع

سڑکوں پہ ناچتی ہیں کنیزیں بتول کی
اور تالیاں بجاتی ہے امت رسول کی

یہ سب کچھ دیکھ کر وہ مسلمان جن کے دلوں میں ایمان کی کوئی رمق باقی ہے اور جو حیا کو ایمان کا لازمی حصہ مانتے ہیں' ان کی پیشانیاں عرقِ ندامت سے تر ہیں' دل سینوں میں بھنچے ہوئے ہیں' فکر مند ہیں اور سوچتے ہیں کہ امت کی یہ پستی کیا رنگ لائے گی ۔ بقول شاعر ع

دیکھی نہ جس کی چال ستاروں نے بھی کبھی
دختر وہ بزم بزم میں رقصاں ہے آج کل

یہ حالات دیکھ کر دل کانپتا ہے کہ کہیں عذابِ الٰہی ہمارا مقدّر نہ بن چکا ہو ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بیروت میں یہی فحاشی اور عریانی جب اپنے عروج پر پہنچی تو غضبِ الٰہی بھڑکا اور پھر اس ملک کو یوں اپنی گرفت میں لیا کہ وہاں چودہ سال سے آگ اور خون کا نہ ختم ہونے والا کھیل جاری ہے ۔ اور انہی عیاشیوں میں ڈوبے سان فرانسسکو کا حشر پچھلے ہفتے سب نے اپنی آنکھوں سے ٹیلی وژن پر دیکھا ہو گا ۔

درد مند دل رکھنے والے لوگوں کے ایک چھوٹے سے قافلے نے جسے تنظیم اسلامی کہا جاتا ہے' پاکستان میں ان منکرات کے خلاف خاموش اور پر امن احتجاجی مظاہروں کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے ۔ سیف گیمز میں خواتین کی شرکت کے خلاف لاہور کے بعد ۱۰ م آباد میں بھی ایک مظاہرے کا پروگرام بنا ۔ تنظیم اسلامی پاکستان کے ناظم اعلیٰ جناب ڈاکٹر عبد الخالق صاحب کے زیرِ ہدایت مشورے کے بعد ۲۲ ر اکتوبر بعد نماز عصر کا وقت طے کیا گیا ۔ راولپنڈی اور اسلام آباد کی مختلف مساجد کے ائمہ کرام سے بھی اس سلسلے میں ۲۰ ر اکتوبر کو جمعہ کے اجتماعات میں قراردادیں پاس کرنے کی اپیل کی گئی ۔ جناب ناظم اعلیٰ ۲۱ ر اکتوبر کو مغرب کے وقت راولپنڈی پہنچ گئے ۔ اور نماز مغرب کے بعد تنظیم اسلامی راولپنڈی ر اسلام آباد کے ایک مشترکہ اجتماع میں مظاہرے کی تفصیلات طے کر لی گئیں ۔

دوسرے دن یعنی ۲۲ ر اکتوبر کو روزنامہ جنگ ر راولپنڈی میں ایک دو کالمی خبر جو کہ میجر (ریٹائرڈ) محمد امین منہاس صاحب کے حوالے سے چھپی تھی' پڑھ کر حیرت ہوئی کہ انہوں نے عام لوگوں کو بھی اس مظاہرے میں شرکت کی دعوت دی تھی ۔ ڈاکٹر عبد الخالق صاحب نے راقم کے ہمراہ مظاہرے کی جگہ کا معائنہ کیا اور اس کے بعد میجر منہاس صاحب سے ملاقات کرنے ہم ان کی رہائش گاہ پر پہنچے ۔ وہاں جا کر پتہ چلا کہ ان کے بیان اور خبر کی وجہ سے ضلعی انتظامیہ خاصی متحرک ہو چکی ہے اور شاید دفعہ ۱۴۴ کی آڑ میں سخت کارروائی بھی کی جائے ۔ میجر منہاس صاحب اپنے حلقہ فہم القرآن اور کچھ دیگر لوگوں کے

ہمراہ مظاہرے میں شرکت کرنا چاہتے تھے اور انتظامیہ کی طرف سے کسی کارروائی کے نتیجے میں گرفتاریاں دینے کے لئے بھی تیار تھے۔ یہ سب کچھ تنظیم اسلامی کی پالیسی سے ہم آہنگ نہ تھا۔ لہٰذا وہاں پر اور پھر مظاہرے سے کچھ پہلے بھی یہ طے کر لیا گیا کہ جو حضرات بھی ہمارا ساتھ دینا چاہیں انہیں ہمارے نظم کا پابند ہو کر مظاہرے میں شرکت کرنا ہو گی۔ اور مظاہرہ خاموش اور پر امن ہو گا۔ اسلام آباد کی ضلعی انتظامیہ پولیس کی بھاری نفری کے ساتھ مسجد کے باہر موجود تھی۔

نمازِ عصر مسجد الشہداء آب پارہ میں ہی ادا کی گئی۔ نماز کے بعد جناب ناظم اعلیٰ نے ہدایات جاری کیں۔ اور اس کے بعد رفقاء تنظیم اسلامی بینرز اور ٹی بورڈز لے کر باہر آگئے اور سڑک کے ساتھ ایک قطار میں خاموشی سے کھڑے ہوتے گئے۔ میجر (ریٹائرڈ) محمد امین منہاس صاحب اور ان کے اراکین نے بھی مظاہرے میں حصہ لیا۔ انتظامیہ کو بتا دیا گیا تھا کہ نظم کے ہم خود ذمہ دار ہیں اور فکر کی کوئی بات نہیں۔ میجر صاحب کے ہمراہ باپردہ خواتین نے بھی مظاہرے میں شرکت کی۔ یہ مظاہرہ ایک گھنٹہ جاری رہنے کے بعد نمازِ مغرب سے چند منٹ پہلے ختم کر دیا گیا۔

مظاہرے کے دوران ہینڈ بل بھی تقسیم کئے گئے۔ اخباری خبر کے باعث اور پھر سیف گیمز کے سٹیڈیم کے قریب ہونے کے باعث مظاہرے کی کوریج کے لئے کافی اخباری نمائندے موقع پر آئے، جن میں غیر ملکی نامہ نگار بھی تھے اور وہ ہر عبارت کی تصویر بنا رہے تھے۔ سڑک پر سے گزرتے ہوئے کئی سفارت کاروں نے بھی گاڑیاں روک کر عبارات پڑھیں۔ پولیس افسران نے بھی مظاہرے کے انداز اور مضمون کو سراہا۔ اس مظاہرے میں تنظیم کے قریباً ڈیڑھ سو رفقاء نے شرکت کی۔ دوسرے دن "جنگ" راولپنڈی نے مظاہرے کی دو کالمی خبر لگائی۔ لیکن یہ غلط رپورٹنگ بھی کی کہ وہاں نعرے لگائے گئے۔ جب کہ ایسا ہرگز نہیں ہوا تھا۔

(مرتب: محمد نیاز مرزا)

بقیہ: دعوت و تحریک

۱۷۔ شعبان ۱۳۵۸ھ
۱۸۔ یہ راقم الحروف کے پاس محفوظ ہے
۱۹۔ النساء: ۹۵، ۹۶۔
۲۰۔ یہ کتاب اب دو حصوں میں شائع ہو رہی ہے اور اس کا ترجمہ عربی میں بھی ہو چکا ہے،
۲۱۔ یہ اب دو حصوں میں شائع ہو رہی ہے۔ کل صفحات ۱۲۰۰ ہیں۔

(جاری ہے)

"شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر"

شام الہدیٰ کراچی کی تقریب میں امّتِ مسلمہ کا ماضی، حال اور مستقبل کے موضوع پر امیرِ تنظیمِ اسلامی کا خطاب

کراچی کی ہنگامہ پرور اور سہمی سہمی سی فضا میں "کتاب الہدیٰ" سے روشنی حاصل کرنے کی خاطر "شام الہدیٰ" کا انعقاد ایک طویل عرصہ کے بعد ریکس آڈیٹوریم میں ۲۴ ستمبر کو کیا گیا۔ ابتداءً ہر ماہ باقاعدگی سے منعقد ہونے والی اس دینی تقریب میں لمبے وقفوں کے در آنے کا بڑا سبب دراصل امیرِ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مدّ ظلہ کی تالیفی و تصنیفی مصروفیات اور اندرون و بیرونِ ملک تنظیمی و تبلیغی سرگرمیاں ہیں، جبکہ شام الہدیٰ کے واحد مقرر بھی وہی ہیں۔

کراچی میں ان تقاریب و مجالس کا اہتمام انجمن خدام القرآن سندھ کرتی ہے جس کے اغراض و مقاصد میں تعلیم و تعلّم قرآن اور ترویج و اشاعتِ تعلیماتِ قرآنیہ کو اوّلیت حاصل ہے۔ اس دفعہ خطاب کا موضوع تھا "امّتِ مسلمہ کا ماضی، حال اور مستقبل" جس پر محترم ڈاکٹر صاحب نے تقریباً ڈھائی گھنٹہ خطاب فرمایا۔ پوری طرح بھرے ہوئے ائیر کنڈیشنڈ ہال میں سکون و اطمینان سے بیٹھے ہوئے سامعین کا تعلق مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تھا اور ایک معتد بہ تعداد میں خواتین بھی موجود تھیں جن کے لئے پردہ کا انتظام تھا۔

شام الہدیٰ کی اس تقریب کا آغاز موضوع کی مناسبت سے منتخب کردہ چند اشعار سے ہوا جسے ترنّم سے پیش کرنے کا اعزاز حاصل کرنے والے تنظیم اسلامی کے سرگرم رفیق جناب عبد المجید شیخ تھے۔ عشقِ رسول میں ڈوبے ہوئے شیخ صاحب سوزِ دروں کا اظہار اس طرح کر رہے تھے۔ ؎

جس دور پہ نازاں تھا عالم، اب ہم وہ زمانہ بھول گئے
اور لہو و لعب میں گم ہو کر پاکیزہ فسانہ بھول گئے

اور ؎

وہ ذکرِ حبیں، رحمت کا امیں، کہتے ہیں جسے قرآن مبیں
جو درس شہِ بطحا نے دیا، ہم پڑھنا پڑھانا بھول گئے

بعد ازیں امیرِ محترم کے رفیقِ کار و معاون خصوصی جناب سراج الحق سید صاحب نے، جو کہ انجمن کے صدر بھی ہیں، اپنے افتتاحی کلمات کا آغاز موضوع سے متعلق چند وضاحتوں سے کیا۔ ساتھ ہی

دھیرے دھیرے، میٹھے میٹھے سے انداز میں اس تقریب میں طویل تعطل کے اسباب بھی بیان کر دیئے اور مجلس کے اصل خطیب و مقرّر کو دعوتِ خطاب دے کر اپنی بات ختم کر دی۔

امیر محترم نے اپنے خطاب کا آغاز سورۃ بنی اسرائیل کی ابتدائی چند آیات اور امتِ موسیٰؑ اور امتِ محمدؐ میں مشابہت سے متعلق ایک حدیث کے تلاوت و ترجمہ سے کیا۔ مختصر سے وقت میں چودہ سو سالہ تاریخ کے جائزہ و تجزیہ کے علاوہ حال و مستقبل کے مشاہدات و خدشات کو بڑی جامعیت سے پیش کر دینا یقیناً سمندر کو کوزہ میں بند کر دینے کے مترادف ہے۔ یہاں تاریخ و فلسفۂ تاریخ پر مبنی اس فکر انگیز و پُر مغز خطاب کو اختصار سے پیش کیا جاتا ہے۔ ماضی کے دھندلکوں سے پردے اٹھاتے ہوئے امیر محترم نے فرمایا:

اقوام اپنی تاریخ سے نابلد یا منقطع ہو جانے کے بعد بے لنگر جہاز کے مانند ہو جاتی ہیں۔ کسی قوم کے لئے اس کے ماضی کی حیثیت وہی ہوتی ہے جو کسی فرد کے لئے اس کی یادداشت کی۔ آج امتِ مسلمہ کو نہ ماضی یاد ہے، نہ مستقبل کی فکر۔ وہ صرف حال کے مسائل میں سرگشت و سرگرداں ہے۔ "نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم، رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو یہ بھی کیا معلوم"۔ ماضی کے ہوش اور مستقبل کی فکر کے بغیر کسی مثبت تبدیلی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ امتِ مسلمہ کا 'ماضی' ۶۲۲ء سے ۱۹۲۴ء تک کے عرصے پر محیط ہے جب خلافت عثمانیہ کا خاتمہ ہوا۔ اور اس کے بعد نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ 'حال' ہے جو تا حال جاری ہے۔ جامع ترمذی کی حدیث ہے: "میری امت پر بھی وہ تمام احوال وارد ہو کر رہیں گے جو بنی اسرائیل پر ہوئے، بالکل ایسے جیسے ایک جوتا دوسرے جوتے کے مشابہ ہوتا ہے"۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ جس طرح تاریخ بنی اسرائیل کے چار ادوار ہیں، اسی طرح امت مسلمہ کے بھی چار ادوار ہیں... دو عروج اور دو زوال۔ واضح رہے کہ قوموں کا عروج و زوال سالوں پر نہیں، صدیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

بنی اسرائیل کا پہلا دورِ عروج حضرت طالوت، داؤد اور سلیمانؑ کی سرکردگی میں سلطنت و حکومت اور سطوت و غلبہ کا دور ہے۔ لیکن ان کے بعد سلطنت دو حصوں میں منقسم ہو گئی اور بالآخر اخلاقی و دینی پستی کی وجہ سے اس کا خاتمہ ہو گیا۔ بخت نصر کے ہاتھوں جس نے اسے تاخت و تاراج کیا۔ چھ لاکھ یہودی قتل کئے گئے اور چھ لاکھ ہی کو وہ قیدی بنا کر اپنے ساتھ لے گیا جن میں عورتیں، بچے، بوڑھے اور جوان سبھی شامل تھے۔ یہاں تک کہ ایک متنفس بھی باقی نہ رہا اور دو جڑی ہوئی اینٹیں بھی سالم نہ بچیں۔ اپنے وقت میں حضرت عزیرؑ جب اس بستی پر سے گزرے تو پکار اٹھے کہ کیا یہ مردہ بستی بھی دوبارہ زندہ ہو سکے گی۔ انہی کا زمانہ بنی اسرائیل کے عروج کا دوسرا نقطۂ آغاز ہے، حتیٰ کہ ذوالقرنین (سائرس) نے بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلائی اور تجدید ایمان و توبہ کے نتیجے میں انہیں دوبارہ شان و شوکت اور عروج و غلبہ حاصل ہوا۔ اُس کا دوسرا زوال ۸۰ء میں ٹائیٹس رومی کے ہاتھوں شروع ہوا جب ایک لاکھ بیس ہزار یہودی ایک دن میں قتل ہوئے اور انہیں یروشلم سے دیس نکالا مل گیا اور پھر حضرت عمرؓ کے دورِ

خلافت میں انہیں دوبارہ یہاں بسنے کی اجازت ملی۔

بعینہٖ امتِ مسلمہ کے عروج و زوال کے بھی چار ہی ادوار ہیں۔ ابتدائی چار سو سال تک عربوں کے زیرِ قیادت مسلمانوں کو غلبہ حاصل رہا۔ اسی دوران اسلام ہسپانیہ سے لے کر سندھ تک پھیلا۔ یہ عروج خالصتاً عرب مزاج کے زیرِ اثر رہا۔ اس میں نہ منطق تھی، نہ فلسفہ اور نہ ہی فرقہ واریت۔ البتہ بنو عباس کے نصفِ آخر سے زوال شروع ہوا جب دربار میں طاؤس و رباب اور رقص و سرود اور محلات میں کنیزوں کی صورت میں دنیا بھر کے حُسن کا اجتماع ہونا شروع ہوا۔ اس کی سزا دو حصوں میں ملی۔ پہلے شمال سے صلیبی جنگوں کی یلغار ہوئی۔ ۱۰۹۹ء میں یروشلم میں صلیبیوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا ایسا قتلِ عام ہوا کہ خون کے دریا بہہ گئے۔ بیت المقدس کی گلیوں میں ایک دن میں ستر ہزار مسلمان قتل کیے گئے۔ دوسری طرف مشرق سے فتنۂ تاتار اٹھا اور کروڑوں کی تعداد میں مسلمانوں کو تہ تیغ کیا گیا، ان کی کھوپڑیوں کے مینار بنائے گئے جن پر بیٹھ کر تاتاری سرداروں نے شراب کے جام پیئے۔ ۱۲۵۸ء میں بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی اور اسی کے ساتھ عرب اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ بھی عجب اتفاق ہے کہ اس فتنہ کا رخ ہندوستان کی طرف نہیں بڑھا۔ صرف بلبن کے زمانے میں ایک شہزادہ اُن کے ہاتھوں قتل ہوا۔ لیکن اس کا اصل زور عربوں ہی کی طرف رہا۔

بعد ازاں صلاح الدین ایوبی اور نور الدین زنگی کی مجاہدانہ کوششوں سے یروشلم واگذار ہوا اور دوسری طرف یہ صوفیائے کرام کا سنہری کارنامہ ہے کہ ان کی کوششوں سے تاتاری دولتِ ایمان سے متصف ہوئے اور ان تاتاریوں ہی کی سرکردگی میں مسلمانوں کی چار عظیم الشان سلطنتیں دنیا کے نقشہ پر ابھریں جن میں ترکانِ تیموری (مغل) ہندوستان میں، ترکانِ صفوی ایران میں، ترکانِ سلجوقی مشرقِ وسطیٰ میں اور ترکانِ عثمانی ترکی میں برسرِ اقتدار رہے۔ پانچویں سلطنت البتہ ہسپانیہ میں امویوں ہی کے زیرِ قیادت برقرار رہی۔ یہاں یہ بھی واضح رہے کہ اگرچہ سلطنت ایک نہ رہی تھی لیکن ملّتِ اسلامیہ ایک وحدت ہی تھی۔ حکومتوں کی تقسیم صرف انتظامی نوعیت کی تھی اور ملکوں کی حیثیت محض صوبوں جیسی تھی۔ ہر مسلمان پوری امتِ مسلمہ کا بین الاقوامی شہری تھا۔ اسے کسی پاسپورٹ اور ویزا کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ کسی بھی سلطنت میں منصب حاصل کر سکتا تھا۔ ملّت کی یہ حیثیت بیسویں صدی کے آغاز تک برقرار تھی۔

مسلمانوں کے دوسرے زوال کی ابتدا سقوطِ غرناطہ و اختتامِ سلطنتِ ہسپانیہ سے ہوتی ہے۔ قرطبہ اور غرناطہ کی یونیورسٹیوں سے تعلیم یافتہ عیسائی نوجوانوں نے یورپ میں تحریک احیاء العلوم (Renaissance) کا آغاز کیا، پاپائیت کے خلاف تحریک چلائی اور اصلاحِ مذہب (Reformation) کا نعرہ بلند کیا۔ اُدھر ۱۴۹۲ء میں ہسپانیہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکلتا ہے تو اِدھر ۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما راس امید کا چکر لگا کر ہندوستان کے ساحل پر بطور تاجر اترتا ہے اور اس طرح یہاں یورپی استعماریت کا

آغاز ہوتا ہے۔ انہی کی سازشوں سے اس صدی کے آغاز میں خلافت عثمانیہ کا خاتمہ ہوا۔ لسانی و نسلی قومیتوں کے بیج بوئے گئے۔ ترکوں کے خلاف عربوں کو بغاوت پر ابھارا گیا اور شدید قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا گیا۔ فرانس، برطانیہ اور اٹلی نے مسلمانوں کی سلطنتوں کے حصے بخرے کر دیئے۔

قصیدوں اور مرثیوں کے تأثر سے اٹھنے والی سامعین کی ہلکی ہلکی سسکیوں اور آہوں کے آہنگ میں امیر محترم نے وہ حدیث بھی بیان کر دی جس میں مسلمانوں کے زوال کے اسباب "حبّ الدنیا و کراہیۃ الموت" کو قرار دیا گیا ہے۔ ماضی کے تجزیہ کے بعد حال کا جائزہ لیتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ حال کا منظر پینسٹھ سالوں پر محیط ہے جو ۱۹۲۴ء سے شروع ہو کر ہنوز جاری ہے۔ اس دور میں دو عمل پہلو بہ پہلو جاری ہیں۔ زوال بھی گہرا ہوتا جا رہا ہے اور احیائی عمل بھی شروع ہو چکا ہے۔ لیکن زوال کے سائے گہرے اور دبیز ہوتے جا رہے ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں عرب اسرائیل جنگ میں عربوں کو شرمناک شکست و ہزیمت اٹھانا پڑی، مسجد اقصیٰ پر یہودیوں کا قبضہ ہو گیا جو تا حال جاری ہے۔ اسی طرح ۱۹۷۱ء میں سقوطِ ڈھاکہ کا سانحہ ہوا۔ بنگلہ دیش سے مدھیا پردیش کے جنگی کیمپوں میں ایک لاکھ کے لگ بھگ کڑیل جوانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ٹرکوں میں لاد کر لے جایا گیا۔

اگرچہ اس دور میں آزادی کی تحریکوں کے ذریعے تقریباً پورا عالم اسلام آزاد ہو چکا ہے لیکن مغرب کی ذہنی، تہذیبی، تمدنی اور معاشی غلامی سے ابھی تک نجات نہیں ملی ہے۔ ہتھیاروں کا بنانا اور خریدنا، جنگ اور صلح کے معاملات بھی اُن کی اجازت کے بغیر طے نہیں ہو سکتے۔ آزادی کی یہ تحریکیں "قومی" تھیں البتہ تحریک پاکستان میں "لا الہ الا اللہ" کا نعرہ لگایا گیا۔ ان تمام تحریکوں کے زعماء کا اسلام سے کوئی گہرا تعلق نظر نہیں آتا۔ آزادی کی ان تحریکوں کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اسلام کی احیائی تحریکوں کے لئے کام کرنے میں سہولت پیدا ہوئی۔ مختلف مسلم ممالک میں بڑی بڑی احیائی تحریکیں برپا ہوئیں۔ اس دور ان علماء مذہبی نوعیت کا کام کرتے رہے اور اسلام کے دفاع کے لئے بڑی خدمات سر انجام دیں۔ ختم نبوت، انکارِ سنّت اور تحریفِ دین جیسے فتنوں کے سدّباب میں انہوں نے بھرپور کردار ادا کیا۔ علماء ہی کی زیر قیادت تبلیغی جماعت نے عام مسلمانوں کو اتباعِ سنت اور ذوق و شوقِ عبادت کی طرف راغب کرنے کے لئے بہت بڑی تحریک برپا کر دی۔ چونکہ ہمارے علماء جدید تعلیم سے بہرہ مند نہ ہو سکے اور احیاء اسلام کی جدوجہد کے لئے جو صلاحیتیں درکار ہیں ان سے بھی مسلح نہ ہو سکے، لہٰذا ہماری احیائی تحریکوں کی باگ ڈور سکہ بند علماء کے ہاتھوں میں نہیں رہی۔ پھر یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ نصف صدی گزر جانے کے باوجود ان احیائی تحریکوں کو خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ یہ تحریکیں اب بڑھاپے کے دور میں داخل ہو چکی ہیں اور اُن میں فرقوں کی سی کیفیت پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ ان تحریکوں میں ایک کمی یہ بھی رہی کہ اُن میں "ایمان" کی بجائے "اسلام" پر زور دیا گیا۔ یعنی اسلام کے ایک "نظام حیات" ہونے کے پہلو کو زیادہ اجاگر کیا گیا۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ایمان و یقین اس درجہ کا حاصل

ہو جائے جو صرف قال نہیں حال بن جائے۔

یہی کچھ معاملہ مستقبل قریب میں بھی نظر آتا ہے اور صورت حال مخدوش نظر آرہی ہے۔ البتہ بشارتِ رسولؐ کے بموجب ہمارے ایمان کا تقاضا ہے کہ ہم اسلام کے غلبہ و عروج سے متعلق پُر امید رہیں۔ اسلام آخر کار روئے زمین کے چپہ چپہ پر غالب ہو کر رہے گا۔ کوئی پکا مکان یا بانوں کا بنا ہوا خیمہ نہ ہو گا جہاں اسلام داخل نہ ہو جائے' چاہے کسی عزت دار کی عزت میں اضافہ ہو یا ذلیل کی ذلت میں۔ ان معاملات کی تکمیل کے لئے بھی اسٹیج تیار ہوتا نظر آرہا ہے۔ دریں حالات مسلمانوں کی زبوں حالی کی وجہ سے امریکہ اور یورپ میں سرمستی اور خوشی کا عالم ہے۔ ایک طرف روس کی شکست و نظریاتی پسپائی اس کا باعث ہے تو دوسری طرف انہیں اپنے تہذیب و اقدار اور فکر و فلسفہ اور سیکولر نظام کا غلبہ مسلم ممالک میں بھی روز افزوں نظر آتا ہے۔ امریکہ میں پاکستان کی خاتون وزیر اعظم کا والہانہ استقبال بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ وقتی طور پر تو انہی کے تمدن و فلسفہ کی بالادستی ہوئی ہے اور ہمارے حالات زیادہ خراب ہیں۔ مشرقی پاکستان میں خونریزی اور سرزمین سندھ کے موجودہ حالات مغربی نیشنلزم ہی کی تحریکوں کا شاخسانہ ہیں' جو اب ایک اور انداز سے رنگ لا رہی ہیں۔ اس کے باوجود یورپ کو مسلمانوں سے دھڑکا لگا رہتا ہے۔ 'بنیاد پرستی' کی اصطلاح اور 'زرد اقوام' سے الفدر کا فقرہ اسی لئے ایجاد کئے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ افغانستان میں امریکہ کی دلچسپی صرف روسیوں کے انخلاء تک تھی۔ وہ نہیں چاہتا کہ وہاں اسلامی حکومت قائم ہو جائے۔

خود مسلمان اپنے کرتوتوں کی وجہ سے عذاب الٰہی کے مرتکب ہو چکے ہیں۔ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا لیکن ہم مسلسل بد عہدی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ ایک خاتون کو وزیر اعظم بنا دیئے جانے کے جرم میں ہر وہ شخص شریک ہے جس کے اپنے گھر میں شرعی پردہ نافذ نہیں ہے۔ عورت کا اس طرح حکومت و سیادت میں جلوہ گر ہو جانا کوئی اچانک اور یکلخت نہیں ہوا ہے' بلکہ اس سے قبل عورتوں کو وزارت و سفارت اور دیگر اعلیٰ عہدوں پر مردوں کے شانہ بشانہ فائز کیا جاتا رہا ہے۔ تا آنکہ وہ آج بحیثیت وزیر اعظم ہمارے سروں پر مسلط ہے۔ نوع انسانی کی اصل ضرورت ایک عادلانہ نظام کا قیام ہے۔

خطاب ختم ہوا تو فضا بڑی بوجھل ہو چکی تھی۔ نہ جانے سینوں کے کتنے زخم ہرے ہو چکے تھے۔ سامعین سر جھکائے خاموشی سے آہستہ آہستہ نماز عشاء کے لئے صحن میں جمع ہونے لگے۔

(مرتب : رحیم کاشفی)

نزلہ زکام اور کھانسی کا ایک سبب
دُھواں اور دُھول!
سُعالین
ان بیماریوں سے صحّت یابی کا اُصول
A HERBAL CURE FOR COUGH COLD AND BRONCHITIS
Sualin
سڑکوں پر دھواں، گلی کوچوں میں دھول اور ماحول میں آلودگی سے نزلہ، زکام، گلے کی خراش اور کھانسی کی شکایات پیدا ہو جاتی ہیں۔ سُعالین کا استعمال ان شکایات سے محفوظ رہنے کی اچھی تدبیر بھی ہے اور مفید علاج بھی۔
سُعالین ہمارے ماحول، مزاج اور آب و ہوا سے مطابقت رکھنے والی مُفید و موثّر جڑی بوٹیوں سے تیار کی جاتی ہے۔ یہ نزلہ زکام، کھانسی اور گلے کی خراش سے آپ کو عارضی افاقہ کے بجائے مکمّل آرام پہنچاتی ہے۔
گھر ہو یا دفتر، قیام ہو یا سفر سُعالین ہمیشہ اپنے ساتھ رکھیے۔
SUALIN
50 TABLETS
A HERBAL CURE FOR COUGH COLDS AND BRONCHITIS
سُعالین
نزلہ زکام اور کھانسی کا مفید علاج
آوازِ اخلاق
دیانت داری خود اعتمادی پیدا کرتی ہے
Adarts-SUA-1/89

بقیہ: حرفِ اوّل

مہم کا آغاز کیا ہے، اس میں تازہ اضافہ سیف گیمز میں خواتین کی شرکت کے خلاف مظاہروں کا ہوا ہے۔ سیف گیمز کے آغاز سے متصلاً قبل لاہور میں ریگل چوک میں ایک خاموش لیکن بھرپور احتجاجی مظاہرہ کیا گیا اور پھر سیف گیمز کے آغاز پر اسلام آباد میں بھی خاموش مظاہرے کی شکل میں صدائے احتجاج بلند کی گئی اور اس 'قومی بے عزتی' پر عوام کے ضمیر کو جھنجھوڑنے اور اس معاملے میں اپنے جذبات اُن تک پہنچانے کی کوشش کی گئی لیکن ڈھاک کے وہی تین پات! بہرکیف لوگ اگر اپنی خو نہیں چھوڑتے تو ہم اپنی وضع کیوں بدلیں۔ ہمیں اندازہ پہلے بھی تھا اور اب تجربہ بھی ہو گیا کہ معاشرہ اس حد تک بگڑ چکا ہے کہ منکرات اب معروف کا درجہ اختیار کر چکے ہیں لیکن ہمیں تو اپنی ہمت و وسعت کے مطابق نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے رہنا ہے۔ اور کچھ نہیں تو یوم قیامت اپنے پروردگار کے حضور معذرت تو پیش کر سکیں گے کہ ہم نے اپنی سی کوشش کر دیکھی تھی، اور کیا عجب کہ "لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ" والا معاملہ ہو جائے اور اسی مضمحل معاشرے سے دینی غیرت و حمیت رکھنے والے کچھ باہمت لوگ میدانِ عمل میں نکل آئیں اور غلبہ و احیاءِ اسلام کی راہ ہموار ہو سکے۔

ماہنامہ 'میثاق' کے ۱۹۶۷-۶۸ء کے اداریوں پر مشتمل

ڈاکٹر اسرار احمد کی ایک اہم تالیف

اسلام اور پاکستان

نیا ایڈیشن، نئی خوبصورت کتابت اور دیدہ زیب طباعت کے ساتھ شائع ہو گیا ہے

قیمت: اعلیٰ ایڈیشن (مجلّد) -/۴۰ روپے، اشاعتِ عام -/۱۵ روپے

بھارت میں چودہ (۱۴) دن

مرتب: شیخ رحیم الدین

فروری ۱۹۷۵ء کا وہ مبارک دن تھا جب اللہ تعالیٰ کے ایک صاحبِ عزیمت بندے ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنے رب کے حضور انتہائی عاجزی اور الحاح و زاری سے یہ عہد کیا کہ "اب میری زندگی کے شب و روز صرف تیری آخری کتاب یعنی قرآن حکیم کی تعلیمات کو عام کرنے اور اسلامی انقلاب برپا کرنے کی سعی کے لئے وقف ہوں گے"۔ اپنے اس بندے کے اس جذبے اور ارادے کو حق تعالیٰ شانہ نے فتقبلها ربها بقبول حسن کے مصداق قبول فرمایا ۔ یہ عہد کرتے ہوئے یہ نوید جانفزا اس بندے کے مدنظر تھی کہ ۔ ومن اراد الاخرۃ وسعی لھا سعیھا وھو مومن فاولئک کان سعیھم مشکورا ○

اس صاحبِ عزیمت بندے نے اس بشارت کی حقانیت پر یقینِ کامل رکھتے ہوئے اپنے چین و آرام اور گھر کے سکون و راحت کو پسِ پشت ڈال کر قرآنی تعلیمات کو عام کرنے اور اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے بھرپور جدوجہد کا آغاز کر دیا۔ اب وہ قریہ قریہ گاؤں گاؤں شہر شہر اور ملک ملک قرآن کی انقلابی دعوت پہنچانے کے لئے اس قرآنی آیت کے مصداق سرگرم عمل ہیں کہ "قل ھذہ سبیلی ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ"

انہیں اپنے مشن کی حقانیت اور طریقۂ کار کے اقرب الی السنۃ ہونے کا حق الیقین حاصل ہے اور ان کا یہی یقین نامساعد حالات اور کمر توڑ دینے والی صورت حال کے باوصف تھک ہار کر بیٹھنے نہیں دیتا اس لئے کہ انہیں حق الیقین حاصل ہے کہ دعوتِ دین کا کیا ہوا کام کبھی رائیگاں نہیں جاتا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق جلد یا بدیر پورے کرہ ارضی پر اللہ کا دین غالب ہو کر رہے گا (ان شاء اللہ)

ان کا قرآن حکیم کی تعلیمات کو عام کرنے کا عہد "دعوت رجوع الی القرآن" کے نام سے معنون ہوا اور اس دعوت کو چار دانگِ عالم میں پھیلانے کے لئے "مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور" وجود میں آئی جس نے محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اپنے محدود وسائل کے باوصف قرآن حکیم کے انقلابی فکر کو ان کے دروس و تقاریر، دعوتی دوروں کے پروگراموں، دروسِ قرآن کے آڈیو اور وڈیو کیسٹس اور کتب کی اشاعت کے ذریعے صرف ملک کے گوشے گوشے ہی میں نہیں بلکہ بیرون ملک بھی دور دور تک پہنچا دیا اور اب یہ دعوت رجوع الی القرآن کی تحریک اللہ کی نصرت و تائید سے کہیں دبے پاؤں اور

کہیں بیانگِ دہل قدم بہ قدم آگے بڑھ رہی ہے۔

دعوت رجوع الی القرآن کی یہ تحریک بذریعہ آڈیو اور وڈیو کیسٹس ضم کدۂ ہند کے ایک مرکزی شہر "حیدر آباد دکن" میں محترم حیدر محی الدین غوری صاحب کی معرفت پہنچی۔ موصوف ملازمت کے سلسلے میں امریکہ کے شہر شکاگو میں مقیم تھے کہ وہیں امیر محترم کے کیسٹس سننے کے بعد زندگی کے شب و روز میں تبدیلی آئی اور پھر وہ بھی اس دعوت کو عام کرنے میں کوشاں ہو گئے۔ انہوں نے بیسیوں کیسٹس حیدر آباد دکن میں اپنے اعزہ و اقرباء اور جاننے والوں کو ارسال کیں اور ان حضرات نے بھی ان کیسٹس کے صرف سننے اور دیکھنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کی سینکڑوں کاپیاں بنا کر مسلم گھرانوں میں پھیلائیں۔ ویسے حیدر آباد دکن کے مسلمانوں میں دین و مذہب سے لگاؤ اور علمی اور عملی وابستگی کی جڑیں برعظیم پاک و ہند کے بقیہ مسلمانوں کی بہ نسبت زیادہ گہری ہیں جس کی وجہ سے یہ دعوت وہاں بہت عام ہوئی اور دینی مزاج رکھنے والا ہر شخص امیر تنظیم اسلامی سے غائبانہ متعارف ہی نہیں ہوا بلکہ قرآن حکیم سے امیر تنظیم کے خصوصی تعلق کی بنا پر دل و جان سے اُن پر فریفتہ بھی ہو گیا۔ چنانچہ ان کا شوقِ لقاء بڑھتا چلا گیا اور انہوں نے دعوت نامے ارسال کرنا شروع کر دیئے۔ ان کے شوق اور جذبے اور محبت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے امیر محترم اپریل ۸۴ء میں حیدر آباد دکن تشریف لے گئے تھے۔ اس سفر میں آپ کے ہم سفر آپ کے خلف الرشید ڈاکٹر عارف رشید تھے۔ امیر محترم نے وہاں تشریف لے جانے کے بعد یہ محسوس کیا کہ وہ غیروں میں نہیں بلکہ اپنی فکر سے متعارف لوگوں کے مابین ہیں۔ آپ کے دروس و خطابات نے وہاں کے مسلمانوں میں ایک نیا جوش و جذبہ پیدا کیا اور کچھ نئے ساتھی میسّر آئے جو کہ رجوع الی القرآن کے مشن کو آگے بڑھانے کے لئے بھرپور طور پر آمادہ تھے۔ امیر تنظیم وہاں سے خوشگوار یادیں لئے ہوئے واپس وطن تشریف لائے۔

اگلے ہی سال وہاں سے پھر دعوت نامے آنے شروع ہو گئے۔ اس بار احباب کا اصرار تھا کہ مجلس تعمیر ملت کے زیر اہتمام ۱۲ ربیع الاول کے مرکزی جلسۂ سیرت سے امیر تنظیم خطاب فرمائیں۔ یوم رحمۃٌ للعالمین کا سالانہ جلسہ حیدر آباد دکن کی قدیم روایات میں سے ہے اور حاضرین کی تعداد کے اعتبار سے اسے سیرت النبی کا عظیم ترین اجتماع کہنا غلط نہ ہو گا۔ چنانچہ امیر محترم اپنے مصروف وقت میں سے کچھ چند دن نکال کر نومبر ۸۵ء میں دوسری بار حیدر آباد دکن تشریف لے گئے۔ اس سفر میں آپ کے ہم رکاب آپ کے فرزند سعید محترم عاکف سعید تھے۔ یہ دورہ انتہائی کامیاب اور بھرپور رہا۔ اور اس کی خوشگوار یادیں امیر محترم کے قلب و دماغ پر آج تک ثبت ہیں۔ اسی دورے کے دوران انجمن خدام القرآن انڈیا کی بنیاد پڑی جو کہ الحمدللہ قرآن کے انقلابی فکر کو عام کرنے کے لئے اپنے وسائل میں رہتے ہوئے جدوجہد کر رہی ہے۔ مزید برآں اُسی موقع پر بارہ افراد اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے آپ کے دستِ مبارک پر بیعت کر کے شاملِ تنظیم اسلامی ہوئے۔

گذشتہ چار سال سے ہندوستان کے کئی گوشوں سے امیر تنظیم کو دعوت نامے موصول ہو رہے تھے مگر حالات اس بات کی اجازت نہیں دے رہے تھے ۔ لیکن اس دفعہ وہاں کے احباب کا اصرار اتنا شدید ہو گیا کہ امیر تنظیم انکار نہ فرما سکے اور انجمن خدام القرآن انڈیا کی دعوت پر ہندوستان کے دورہ کا پروگرام بنا لیا گیا ۔ اس دورے میں آپ کی ہم رکابی کا شرف احقر کو حاصل ہوا ۔ احقر قریباً سات سال سے آپ کے ساتھ منسلک ہے اور قرآن اکیڈمی کے مختلف کاموں میں شب و روز مشغول ہے ۔ اس سفر میں امیر محترم کی ہم رکابی کا شرف حاصل ہونے کا ایک سبب یہ بھی بنا کہ میری پیدائش حیدر آباد دکن میں ہی ہوئی تھی اور میرے بہت سے اعزہ و اقرباء ابھی تک وہیں مقیم ہیں ۔ امیر محترم اس خیال سے مجھے ساتھ لے گئے کہ اس سفر میں میرے رشتہ داروں سے میری ملاقات کا ذریعہ نکل آئے گا ۔

امیر تنظیم اسلامی کے دورہ بھارت کا اصل مقصد انجمن خدام القرآن انڈیا کی جانب سے منعقد کردہ دروس قرآن اور خطابات عام کے پروگرام میں شرکت فرمانا تھا ۔ اور یہ تمام پروگرام موصوف کی اجازت اور مشورے سے ترتیب دیئے گئے تھے ۔ اس دورہ کا علم جب " مجلس تعمیر ملت " جو کہ حیدر آباد دکن کی ایک معروف دینی انجمن ہے ' کے سرکردہ حضرات خصوصاً سلیمان سکندر صاحب صدر مجلس تعمیر ملت ہیں اور رحیم قریشی صاحب جنرل سیکریٹری مجلس تعمیر ملت و آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کو ہوا تو انہوں نے انجمن خدام القرآن انڈیا کے متعلقین سے مل کر اپنے دو اہم پروگراموں میں امیر موصوف کو مہمان مقرر کی حیثیت سے خطاب کرنے کی دعوت دی ۔ یہ پروگرام حیدر آباد دکن کے سب سے بڑے مذہبی اجتماعات ہوتے ہیں ۔ اسی طرح اس سفر میں امیر محترم کا بنگلور میں بھی تین یوم کا پروگرام متعین تھا ۔ اس کے علاوہ لکھنؤ میں حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ العالی اور مراد آباد میں مولانا افتخار احمد فریدی سے خصوصی ملاقات کا ارادہ تھا ۔ مزید برآں آپ کاندھلہ تشریف لے جا کر مولانا نور الحسن راشد صاحب سے ملاقات کا ارادہ بھی رکھتے تھے ۔ اسی کے ساتھ ساتھ آپ کے پروگرام میں یہ بھی شامل تھا کہ حسین پور جا کر اپنے پڑدادا کی وہ حویلی دیکھی جائے جو انگریز حکومت نے ضبط کر لی تھی ۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ کی خواہش یہ بھی تھی کہ اپنی جائے پیدائش دیکھنے حصار بھی جایا جائے اور دہلی میں جامعہ رحیمیہ میں حاضری دی جائے ۔ اور آج کل وہاں جو انتظامیہ میں شکر رنجی پیدا ہو چکی ہے اس کو دور کرنے کی کوشش کی جائے ۔

اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ہم ۱۲ / اکتوبر ۱۹۸۹ء کو دو بجے پی آئی اے کی پرواز سے دہلی کے لئے روانہ ہوئے اور دو بج کر ۵۰ منٹ پر دہلی کے انٹرنیشنل ایرپورٹ پر اترے ' جب کہ بھارت کے وقت کے مطابق ۳ بج کر ۲۵ منٹ ہو رہے تھے ۔ یہاں سے کسٹم وغیرہ سے فارغ ہو کر باہر نکلے تو پتہ چلا کہ ہمیں خوش آمدید کہنے کے لئے حیدر آباد دکن سے انجمن خدام القرآن انڈیا کے معتمد محترم حیدر محی الدین غوری صاحب تشریف لائے ہوئے ہیں ان کے ساتھ دہلی کے ہی دو حضرات مولانا عطاء

الرحمٰن قاسمی صاحب مدرس جامعہ رحیمیہ دہلی اور رضوان عابد قریشی صاحب جو کہ امیر محترم کے دور کے رشتہ دار بھی ہیں تشریف لائے ہوئے تھے ۔ ہم ان کی معیت میں اندرون ملک پرواز کے لئے دوسرے ایر پورٹ کی طرف روانہ ہوئے جہاں سے ہمیں ایر انڈیا سے سفر کرتے ہوئے حیدر آباد دکن روانہ ہونا تھا۔ ساڑھے چار بجے کے قریب ایر پورٹ پہنچ کر ہم نے عصر کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کی اور پھر پونے چھ بجے کی فلائٹ سے حیدر آباد کے لئے محو پرواز ہوئے ۔ یہ پرواز ایک گھنٹہ پچاس منٹ پر مشتمل تھی ۔ حیدر آباد ایر پورٹ پر امیر محترم کے استقبال کے لئے کئی حضرات موجود تھے ۔ جن میں سے چند اہم شخصیات جن کے نام مجھے یاد رہ گئے ہیں وہ یہ ہیں ۔ انجمن خدام القرآن انڈیا کے صدر محترم قاری محمد عبد العلیم صاحب ' نائب صدر محترم قاری میر قطب الدین علی چشتی صاحب' مجلس تعمیر ملت و آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے جنرل سیکرٹری محترم رحیم قریشی صاحب 'محترم قاری محمد اعظم خان صاحب ' محترم محمد جعفر صاحب ' محترم وقار الدین غوری صاحب ' محترم مہدی علی خان صاحب ' افتخار الدین غوری صاحب اور محترم فیروز الدین صاحب ۔ ان تمام حضرات نے بڑی گرم جوشی اور محبت سے امیر محترم کو خوش آمدید کہا ۔ ہم یہاں سے سیدھے اپنی قیام گاہ کی جانب روانہ ہوئے ۔ ہمارے قیام حیدر آباد کے دوران میزبانی کی ذمہ داری محترم محمد جعفر صاحب نے اپنے ذمے لے رکھی تھی ۔ آپ نظام کلب کے چیف ایگزیکٹو ہیں ۔ اس کلب کی بنیاد مرحوم میر محبوب علی خان آصف جاہ سادس نے رکھی تھی ۔ اس کے علاوہ آپ تعمیراتی کمپنی اور کئی ہوٹلوں کے مالک بھی ہیں ۔ آپ کی جائے رہائش احمد نگر (فرسٹ لانسر) میں واقع ہے ۔ اس کی تین منزلیں ہیں ۔ آپ نے مکان کی تیسری منزل دینی اجتماعات کے لئے وقف کر رکھی ہے ۔ یہاں ہر ہفتے میں ایک دفعہ شہر کے کسی بڑے عالم کو درس قرآن کے لئے مدعو کیا جاتا ہے ۔ اس اجتماع کے لئے جو ہال انہوں نے تیار کروایا ہے وہ ان کے دینی ذوق کا مظہر ہے اس میں ضرورت کا تمام سامان مہیا کیا گیا ہے اور ہال کے متصل ہی ایک مہمان خانہ جو جدید سہولتوں سے آراستہ ہے ' تیار کروایا ہے جو ان دنوں ہمارے تصرف میں رہا ۔ ہم نے اپنی قیام گاہ پہنچتے ہی عشاء کی نماز ادا کی ۔ پھر شام کا کھانا کھایا جس میں وہ تمام افراد شریک تھے جو امیر محترم کا استقبال کرنے کے لئے آئے ہوئے تھے ۔ دستر خوان پر حیدر آبادی طرز کے کھانے موجود تھے ۔ امیر محترم ان کھانوں سے کافی لطف اندوز ہوئے ۔ کھانے کے بعد تمام احباب مل بیٹھے اور دورے کے پروگراموں پر تبادلۂ خیال فرمانے لگے اور امیر محترم کے حیدر آباد دکن کے پروگرام کو آخری شکل دی گئی ۔

۱۳ر اکتوبر صبح فجر کی نماز ایک مقامی مسجد میں ادا کی گئی ۔ وہاں کے نمازی حضرات جوق در جوق امیر محترم سے مصافحہ کرنے کے لئے بڑھے اور امام صاحب نے تو درس قرآن دینے کی دعوت دے دی لیکن امیر محترم نے بہت ہی احسن طریقے سے ان سے معذرت فرمائی اس لئے کہ نماز کے بعد کئی حضرات سے ملاقات کا پروگرام طے تھا ۔ ملاقات کا سلسلہ تقریباً ساڑھے سات تک جاری رہا ۔ آج

یہاں ہندوستان میں ربیع الاول کی بارہ تاریخ تھی جبکہ پاکستان میں ۱۱ر ربیع الاول تھی ۔ آج کے دن کی مناسبت سے مجلس تعمیر ملت نے "یوم رحمۃ للعالمین" کے عنوان سے ایک جلسہ کا پروگرام ترتیب دیا تھا۔ اس جلسے کے واحد مہمان اور مرکزی مقرر امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ہی تھے۔

کل ہند مجلس تعمیر ملت کے زیر اہتمام "یوم رحمۃ للعالمین" کا یہ اجتماع بلا شبہ شرکاء کے ذوق و شوق اور تعداد حاضرین کے اعتبار سے ایک منفرد شان کا حامل تھا اور غالباً پورے عالم اسلام میں سیرت کے موضوع پر اتنے عظیم الشان اجتماع کی کوئی اور نظیر موجود نہیں ہے ۔ یہ اجتماع صبح نو بجے سے ایک بجے تک جاری رہا۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے اپنی ایک گھنٹہ دس منٹ کی طویل تقریر میں ختم نبوت و رسالت اور پاک و ہند کے مسلمانوں کی حالت کے بارے میں تفصیلی روشنی ڈالی ۔ انہوں نے کہا کہ انہیں یہ جان کر دکھ ہوا ہے کہ آج کل ختم نبوت کے باغیوں کی سرگرمیاں بڑھ رہی ہیں ۔ حضرت الیاس برنی مرحوم نے برسوں پہلے مسلمانوں کو اس فتنے کے بارے میں متنبہ کر دیا تھا ۔ آپ نے مزید فرمایا کہ ختم نبوت کے دو پہلو ہیں ۔ ایک پر تو علماء نے توجہ دی اور اپنا حق ادا کر دیا جو اس کا قانونی پہلو ہے ۔ دوسرے پہلو میں عظمت محمدی کا راز پوشیدہ ہے ۔ لیکن وہ چونکہ قانونی نہیں ہے اس لئے اس پر توجہ نہیں دی گئی ۔ قانونی پہلو میں وحی نبوت کا دروازہ آپ کے بعد ہمیشہ ہمیش کے لئے بند کر دیا گیا ۔ آپ نے مزید فرمایا اسلام کی تبلیغ عقل اور دلیل کی بنیاد پر ہے لیکن ہم نے قرآن کو دلیل نہ سمجھا اور نہ ہی پیش کیا جیسا کہ پیش کرنا تھا ۔ آپ نے مشہور مؤرخ ایم این رائے کا حوالہ دیتے ہوئے جس میں انہوں نے کہا تھا "انسانی تاریخ کا عظیم انقلاب وہ تھا جسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے برپا کیا تھا" فرمایا کہ پاکستان جس مقصد کے لئے بنایا گیا تھا آج تک اس کی تکمیل نہیں ہو سکی ۔ ہمارا حال تو یہ ہے کہ ایک فوجی آمر نے عائلی قوانین بنائے تھے جن کی تمام علماء نے مخالفت کی لیکن آج بھی وہ ہمارے ہاں جاری ہیں ۔ ہم اب بھی پاکستان میں اسلامی حکومت کے قیام کی کوشش کر رہے ہیں ۔ ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی شعور کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ ہندوستان کی حکومت کی جانب سے نہیں بلکہ ایک عدالت کے فیصلے کے نتیجے میں جب مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی کی کوشش ہوئی تو مسلمان یک جان ہو کر جسد واحد کی طرح اس کے خلاف ڈٹ گئے ۔ آپ نے فرمایا آنحضور پر جو کتاب قرآن مجید کی شکل میں نازل کی گئی وہ الھدٰی ہے جس میں قیامت تک کے آنے والے انسانوں کے لئے ہدایت و رہنمائی موجود ہے اور قیامت تک اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے لیا ہے اور ایک ایسی مکمل شریعت اور ایسا نظام عدل و قسط دیا گیا ہے جو فطرت کے عین مطابق نہایت توازن اور اعتدال کا حامل ہے ۔ پھر یہی نہیں کہ ایک نظریہ ہے بلکہ آپؐ نے اس نظام کو بالفعل قائم کر کے دنیا کو بتا دیا کہ یہ نظام عدل و قسط واقعتہً ایک مثالی نظام ہے ۔ آپ نے ببانگِ دہل اعلان فرمایا کہ اس امت کے زوال کا بنیادی سبب قرآن حکیم سے دوری اور مہجوری

ہے۔ حجۃ الوداع میں بھی حضور نے یہی فرمایا تھا کہ میں تم میں دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ ایک اللہ کی کتاب اور دوسرے اپنی سنت۔ اگر ان کو مضبوطی سے تھام لو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے ۔

آپ کا بیان اس قدر سحر انگیز اور فکر انگیز تھا کہ قریباً ڈیڑھ لاکھ کا عظیم اجتماع بالکل صامت و ساکت ہو کر ہمہ تن گوش رہا اور پوری تقریر کے دوران کسی فرد نے بھی حرکت کرنے کی کوشش تک نہ کی۔ آپ کی تقریر کے اختتام پر لوگ وارفتگی کے ساتھ آپ کی طرف ٹوٹ پڑے۔ ہر کوئی یہ چاہتا تھا کہ آپ سے مصافحہ کرے۔ منتظمین کو بارہا گذارش کرنی پڑی کہ ابھی جلسے کی کارروائی جاری ہے مگر لوگوں پر اس کا کوئی خاص اثر نظر نہیں آتا تھا۔

ہم یہاں سے فارغ ہو کر سیدھے جمعہ کے لئے جامع مسجد معظم پورہ ملّے پلّی' حیدر آباد پہنچے جو کہ شہر حیدر آباد میں تبلیغی جماعت کا مرکز ہے۔ یہاں آپ نے خطبۂ جمعہ سے قبل احکام و فضائل جمعہ پر ۳۵ منٹ خطاب فرمایا۔ اس مسجد کے اعزازی خطیب محترم قاری محمد عبد العلیم صاحب ہیں۔

امیر محترم کے خطاب جمعہ کے بعد محترم قاری محمد عبد العلیم صاحب نے عربی خطبہ ارشاد فرمایا۔ آپ کا خطبہ سن کر محسوس ہوتا تھا کہ کوئی جوشیلا عرب خطیب خطبہ دے رہا ہے۔ آپ نے خطبہ میں امیر محترم اور دعوت رجوع الی القرآن کے مشن کا تعارف بھی بھرپور انداز میں کرایا۔ جمعہ کی نماز سے فراغت کے بعد ہم سیدھے اپنی قیام گاہ پہنچے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد صرف ایک گھنٹہ کا آرام میسر آسکا۔ عصر کی نماز کے بعد ہمیں سلطان العلوم انجینئرنگ کالج جانا تھا جو کہ بنجارہ ہلز پر واقع ہے۔ یہ کالج مسلمانوں نے اپنے وسائل سے قائم کیا ہے اور اس سے مسلمانان ہند کے نوجوان طلبہ کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے ایک سبیل نکل آئی ہے۔ امیر محترم کے خطاب کا پروگرام مغرب کی نماز کے بعد طے تھا۔ کالج میں آپ کا استقبال کرنے والوں میں محترم امجد علی خان صاحب ای اے ایس' صدر نشین (چیئرمین) سلطان العلوم انجینئرنگ کالج اور شہر کے مشہور و ممتاز فزیشن ڈاکٹر سید عبد المنان صاحب کے علاوہ دیگر اساتذہ کرام بھی شامل تھے۔ کالج کے Debate ہال میں خلاف توقع سامعین کی اتنی بڑی تعداد جمع تھی کہ سارے انتظامات درہم برہم ہو گئے اور منتظمین کو کافی دشواری و پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ انتظامیہ نے فوراً سینکڑوں کرسیاں اضافی منگوائیں مگر اس کے باوجود ہجوم اتنا زیادہ تھا کہ سینکڑوں افراد کو کھڑے رہ کر آپ کا خطاب سماعت کرنا پڑا۔ امیر محترم کا خطاب اس قدر ہمہ گیر' ہمہ جہت اور ہمہ پہلو تھا کہ سامعین جن کی اکثریت اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد پر مشتمل تھی' نہایت دلچسپی اور انہماک سے تقریر سن رہے تھے۔ میں نے سامعین پر متعدد بار نظر ڈالی لیکن ہر بار ہر شخص کو ایسا متجسس اور مضطرب پایا کہ وہ اگلا فقرہ سننے کے لئے بے چین تھا۔ میں نے امیر محترم کے سینکڑوں خطاب سنے ہیں مگر یہ خطاب اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل جدا اور منفرد تھا۔ آپ نے فرد کی اصلاح سے لے کر مملکت اسلامی کے خدوخال تک کے تمام مراحل گنوا دیئے اور اس نکتے کو خصوصی اہمیت سے بیان فرمایا کہ خلافت فی

الارض کے حصول کے لئے علوم جدیدہ میں مہارت تامہ حاصل کرنا لازمی و لابدی ہے۔ اس کے بغیر آپ اقوام عالم کی سربراہی کا فریضہ انجام نہیں دے سکتے۔

ہفتہ ۱۴ر اکتوبر

نماز فجر مقامی مسجد میں ادا کی گئی۔ جس نمازی کو بھی پتہ چلتا کہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مسجد میں موجود ہیں وہ ان سے مصافحہ و معانقہ کی آرزو لے کر آگے بڑھتا اور مصافحہ کے ذریعے قلبی محبت اور دلی مسرت کا اظہار کرتا۔ نماز کے بعد ہم اپنی قیام گاہ پر واپس آئے۔ آج انجمن خدام القرآن انڈیا کی جانب سے "گاندھی بھون کے پرکاشم ہال" میں صبح ۷ بجے امیر محترم کا خطاب تھا۔ امیر محترم کا خیال تھا کہ اتنی صبح لوگ کیسے آئیں گے کیونکہ اولاً تو وہ ورکنگ ڈے تھا۔ اور دوسرے یہ کہ حیدر آباد دکن کے سرکاری دفاتر کے اوقات صبح ۱۰ بجے سے شروع ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے لوگوں کی عادت ہے کہ وہ فجر کی نماز کے بعد سو جاتے ہیں اور پھر آٹھ یا ساڑھے آٹھ بجے بیدار ہو کر دفتر وغیرہ جانے کی تیاری کرتے ہیں۔ لیکن منتظمین مطمئن تھے اور ان کا کہنا یہ تھا کہ لوگ آپ کو سننے کے لئے اپنی نیند قربان کر سکتے ہیں اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ امیر محترم جب صبح چھ بج کر پچپن منٹ پر پرکاشم ہال پہنچے تو ہال اپنی تنگ دامنی کا اظہار کر رہا تھا۔ آپ کو یہاں یہ بتلاتا چلوں کہ اس ہال میں ۱۱۰۰ افراد کے لئے کرسیاں لگی ہوئی ہیں۔ آج کے اس اجلاس کے صدر بیرسٹر نواب میر اکبر علی خان صاحب سابق گورنر اڑیسہ اور اتر پردیش تھے۔ جبکہ مہمان خصوصی ڈاکٹر سید عبد المنان صاحب تھے۔ اس اجلاس میں امیر محترم کی تالیف "رسولِ کامل" انجمن خدام القرآن انڈیا کی جانب سے شائع کر کے پیش کی گئی تھی۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے اسی مناسبت سے آج "رسول کامل" کے عنوان سے خطاب فرمایا۔ اور آپؐ نے دنیا میں جو انقلاب عظیم برپا کیا اس کے مراحل و مدارج یعنی منہج انقلاب نبوی پر سیر حاصل بحث فرمائی۔ تمام سامعین نے آپ کے خطاب کو مکمل نظم و ضبط سے سنا۔ اور اس اجلاس میں خواتین کی بھی بھرپور حاضری تھی۔ منتظمین حیران تھے کہ اتنی صبح صبح خواتین کی اتنی بڑی تعداد کیسے پہنچی۔ یہ صرف اللہ کا فضل و کرم اور قرآن کی انقلابی دعوت کا سحر تھا جو ان کو اتنی صبح کھینچ لے آیا تھا۔ لوگوں نے سیرت پر ایسی بھرپور تقریر کم ہی سنی تھی۔ یہاں سے فارغ ہو کر ہم قریباً دس بجے واپس اپنی قیام گاہ پر پہنچے۔ یہاں آپ سے ملاقات کے لئے محترم ڈاکٹر عبد المنان صاحب تشریف لے آئے اور اپنی کتب کا ایک سیٹ اور اپنی ایک نئی کتاب "علوم القرآن" پیش کی۔ اور اس کی رسم اجراء سے متعلق بات چیت فرمائی۔ اس کے بعد امیر محترم کو ظہر کی نماز تک آرام کا موقع ملا اور احقر اپنے اعزہ و اقارب سے ملنے کے لئے امیر محترم سے رخصت لے کر روانہ ہوا۔

آج مغرب کی نماز کے بعد ہماری قیام گاہ یعنی فتح منزل میں امیر محترم کا خطاب "اسلام میں عورت کا مقام" کے عنوان سے طے تھا مگر منتظمین کو پچھلے دو دن کی حاضری سے اس بات کا احساس ہونے لگا کہ

یہ ہال اور اس سے متعلقہ گیلریز وغیرہ ناکافی ہو جائیں گی تو انہوں نے اس پروگرام کو بنجارہ ہلز روڈ پر واقع بنجارہ میرج ہال میں منتقل کرنے کا فیصلہ کیا اور فی الفور اس کے انتظامات کرنے لگے۔ مغرب کی نماز تک الحمد للہ تمام مراحل طے کر لئے گئے۔ مغرب کی نماز کے متصل بعد پروگرام شروع ہوا۔ امیر محترم کے خطاب سے قبل قاری محمد تقی الدین صاحب نے سورۃ الاحزاب کی آیات ۲۸ تا ۳۵ تلاوت فرمائیں۔ امیر محترم کا خطاب ان ہی آیات کے حوالہ سے ہوا۔ آج کے موضوع کی مناسبت سے عورتوں کی ایک بڑی تعداد خطاب سننے کے لئے آئی ہوئی تھی۔ ایک محتاط اندازہ کے مطابق سامعین کی تعداد چار ہزار کے لگ بھگ تھی۔ امیر محترم نے عورتوں اور مردوں کے حدود کار سے متعلق وضاحت سے بیان فرمایا کہ ان کے میدان عمل جدا جدا ہیں۔ مگر اس میں استثنائی صورتیں بھی ہیں اور اس کے احکام بالکل جدا ہیں۔ آپ کے اس خطاب کے سننے والوں میں مسلمانوں کے علاوہ کئی غیر مسلم حضرات بھی موجود تھے جو کہ آپ کے بیان کو بڑی ہی دلچسپی اور دل جمعی سے سن رہے تھے۔ تقریر کے بعد اسی ہال میں نمازِ عشاء با جماعت ادا کی گئی جس میں کثیر تعداد میں لوگ شریک ہوئے۔ بعد ازاں امیر محترم نے رات ساڑھے گیارہ بجے شہر کی مرکزی جامع مسجد یعنی مکہ مسجد میں کُل ہند مجلس تعمیر ملت کے تحت "یوم صحابہ" کے عنوان سے ایک جلسے سے خطاب فرمایا۔ اس جلسے کے مرکزی مقرر بھی امیر محترم ہی تھے۔ یوم رحمۃ للعالمین کی طرح یہ جلسہ بھی شہر حیدر آباد کا تاریخی جلسہ ہوتا ہے۔ اس میں حاضری پچاس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ اس میں آپ نے قریباً ایک گھنٹہ خطاب فرمایا اور صحابہ کرام کی جانثاری اور سرفروشی کے واقعات سے اور قرآنی حوالوں سے یہ بات واضح فرمائی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ انقلاب عظیم برپا کیا اس میں ان صحابہ کرام کی ایثار و قربانی کو بھی بڑا دخل تھا۔ آپ نے صحابہ کرام کی شان بیان کرتے ہوئے اس فرق کو بھی واضح فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا طرز عمل تو یہ تھا کہ جب جہاد و قتال کی نوبت آئی تو انہوں نے کورا جواب دے دیا اور صاف طور پر کہہ دیا:

"فاذھب انت و ربک فقاتلا انا ھھنا قاعدون"

اس کے برخلاف جب جنگ بدر کا موقع آیا تو صحابہ کرام نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول آپ ہمیں حضرت موسیٰ کے ساتھیوں پر قیاس نہ کیجئے جنہوں نے مشکل وقت میں نبی کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ ہم آپ کے چشم ابرو کے اشارے پر اپنی جان تک نچھاور کر دیں گے۔

جونہی آپ کا خطاب ختم ہوا سامعین شدت جذبات سے کھڑے ہو گئے۔ اور بہت سے آپ سے مصافحہ کرنے کے لئے آگے بڑھے کہ سارا جلسہ درہم برہم ہو گیا۔ منتظمین بار بار اعلان کرتے رہے کہ جلسہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے بلکہ ابھی بعض اہم تقریریں باقی ہیں لیکن ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ایک عظیم اکثریت آپ ہی کو سننے آئی تھی۔ (جاری ہے)

Jawad Products

We are manufacturing and exporting ready made garments (of all kinds including shirts, trousers, blouses, jackets, uniforms, hospital clothing; kitchen aprons), bedlinen, cotton bags, textile piece goods etc.

For furtner details write to :

M/s. Associated Industries (Garments) Pakistan (Private) Ltd.,
IV/C/3-A (Commercial Area),
Nazimabad,
Karachi - 18
Tele : 610220/616018/625594

MONTHLY
Meesaq
LAHORE

Regd. L. No. 7360
VOL.38 No.11
NOVEMBER 1989

معدہ کی گیس — تیزابیت — سینہ کی جلن اور متلی کے لیے

لیکوڈ
گیسٹوفل

تحقیق کی روایت۔ معیار کی ضمانت

QD – 6